نومبر 2007

قیمت : -/10 روپے

اردو دنیا
نئی دہلی

... ن، نئی دہلی
... ی انسانی وسائل، حکومت ہند

غریب نواز ایجوکیشن سوسائٹی رائے پور (چھتیس گڑھ) کی طرف سے اردو طلبہ اور طالبات کو انعامات دینے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید بہ طور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اسٹیج پر جناب شفیع قریشی، جناب اکبر علی فاروقی، ڈاکٹر علی جاوید، جناب وارث جمال قادری، جناب محمود علی فاروقی اور جناب منصور عالم اشرفی۔ تصویر میں صوبے کے مختلف مقامات کے نمائندوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے پروگرام میں شرکت کی۔

''مرکز ادب و سائنس''، رانچی کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے دو کمپیوٹر سینٹرز کے آٹھویں جلسۂ تقسیم اسناد میں شریک مہمان (بائیں سے دائیں)

پروفیسر احمد سجاد، عالمگیر عالم اسپیکر جھارکھنڈ اسمبلی، ڈاکٹر عبدالسبحان وائس چیئر مین جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل، نیاز احمد آئی. پی. ایس اے۔ ڈی۔ جی۔ پی جھارکھنڈ، ڈاکٹر منجو سنہا پرنسپل رانچی ویمنس کالج اور طلبہ اور طالبات۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔11 نومبر 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:

ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6

آر.کے. پورم، نئی دہلی- 066 110

فون:26103381, 26103938

26106159:فیکس 26179657

ویب سائٹ:

http://www.urducouncil.nic.in

email: urduduniyancpul@yahoo.co.in

urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،

آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066

فون:26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22 محمد ظہور ساجد یار جنگ کمپلکس،

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 4

زبان، تعلیم اور صحافت

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمن فاروقی 5

● سرسید کی جدید، لبرل اور سائنسی طرز فکر .... افتخار عالم خاں 8

● اردو صحافت کا ابتدائی دور .... شاہد پرویز 11

● حکیم عبدالحمید کی لسانی فکر .... کاشف غزالی 15

● اردو درس و تدریس چند تلخ حقائق .... راجیش مشرا 18

● نیپال میں اردو .... ممتاز عالم 20

ادب

● کچھ اپنے بارے میں .... قرۃ العین حیدر 22

● گردش رنگ چمن—ایک تاثر .... سلام بن رزاق 28

● اردو تحقیق و تنقید اور گیان چند جین .... عبدالرب 30

● پہلا انڈو جرمن شاعر: فراسو .... راحت ابرار 32

روبرو

● اردو ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے .... نمائندہ فانا سے قرۃ العین حیدر کی بات چیت 34

● پروفیسر عتیق اللہ سے گفتگو .... غضنفر اقبال 35

صحت، ماحولیات اور سائنس

● موبائل فون کی ریڈیائی لہروں کے اثرات .... ریتا بھٹاچاریہ 38

● بدلتا ہوا ماحولیاتی نظام اور ہم .... عبدالرحمن 39

● مطالعۂ زبان اور کمپیوٹر .... صباح الدین احمد 41

ہماری مطبوعات سے

● محرکات کی اصناف بندی .... سید محمد محسن 45

● فضا کا جال .... محمد شمس الحق 48

اردو خبرنامہ .... ادارہ 54

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 70

بچوں کا گوشہ

● کامیابی کی سیڑھی (کہانی) .... نذیر احمد یوسفی 76

آپ کی بات

■ **مظہر امام، B-176، پاکٹ-1، میور وہار، فیز-1، دہلی-110091**

اکتوبر کے "اردو دنیا" میں قرۃ العین حیدر سے متعلق اپنے مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی نے عصمت چغتائی کی لکھی ہوئی "قرۃ العین حیدر کی ایک پیروڈی" کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عصمت چغتائی نے "پوم پوم ڈارلنگ" کے نام سے اپنے مخصوص اسلوب میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں قرۃ العین حیدر کے اندازِ تحریر کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ یہ مضمون "نقوش" لاہور میں چھپا تھا غالباً 1950 میں اور ترقی پسند حلقوں میں بطور خاص اس کا بہت چرچا ہوا۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات عرض کرنی ہے، کیوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ مضمون کا یہ عنوان "پوم پوم ڈارلنگ" عصمت چغتائی کی اختراع نہیں ہے، بلکہ خود قرۃ العین کے ایک افسانے سے اخذ ہے۔ "سویرا" لاہور، شمارہ 6-5، 1949، میں قرۃ العین حیدر کا افسانہ "دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم" شامل ہے۔ اس افسانے کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے:

"یہ تو تم بھی نہیں جان سکتیں پوم پوم ڈارلنگ، پولی نے سر ہلا کر کہا اور پھر ننگ (Knitting) میں مصروف ہوگئی" (انگریزی املا میرا ہے)

برسبیل تذکرہ ـــ "سویرا" کے اسی شمارے میں کرشن چندر کے مرتب کردہ افسانوی انتخاب "پل کے سائے میں" پر ایک تبصرہ شامل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس انتخاب میں سب سے پہلا افسانہ قرۃ العین حیدر کا ہے۔ ان کے تعارف میں کرشن چندر نے لکھا ہے:

"اب ان کی تحریروں میں ایک مغموم گہراؤ (کذا) کی جھلک آتی جارہی ہے اور ایک ایسے جمالیاتی ضبط کا پتہ چلتا ہے جیسے ادیب حاصل کرکے سچائی اور نیکی کے لیے اپنے تجسس کا اظہار کرتا ہے اور اس کی تحقیق میں اپنے ماحول اور سماج کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

پہلے پہل قرۃ العین نے صرف رقص گاہ کی روشنی دیکھی تھی۔ اب اس نے باہر کا اندھیرا بھی دیکھ لیا ہے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند ادبی تحریک، شدت پسندی کے دور سے گزر رہی تھی، اس لیے کرشن چندر کو اس تحریر پر عبداللہ ملک جیسے اشتراکیوں سے لعن طعن سننی پڑی۔

■ **ایم. فاروق نازکی، 58 شیو پورہ، سرینگر، کشمیر**

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ اکتوبر 2007 نظر نواز ہوا اور دلنوازی کا سبب بن گیا۔ "گوشۂ قرۃ العین حیدر"، ہر لحاظ سے خاتونِ اردو کے شایانِ شان ہے۔ مشمولات میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون، اس لیے پسند آیا کہ اردو میں اس طرح کی غیر جانبدار اور Imporsnal تحریریں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پورے مضمون میں مبالغہ آرائی کا شائبہ تک نہیں جو ایسے موقعوں پر اردو کے لکھنے والوں پر غالب آجاتی ہے۔

غالباً 1980 میں قرۃ العین کشمیر تشریف لائی تھیں، ریڈیو کشمیر کے آڈی ٹوریم میں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سامعین کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ اس نشست میں انھوں نے ناول کے فن اور اپنے نظریۂ فن پر بہت سی باتیں کہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریکارڈنگ ریڈیو کشمیر میں آج بھی محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں اگر رفیق راز سے رجوع کیا جائے، تو شاید وہ اس ریکارڈنگ کو سننے کے بعد ایک کارآمد دستاویز تیار کرسکتے ہیں۔ کشمیر میں عینی آپا کا قیام تقریباً ایک ماہ کا رہا ہوگا۔ انھی دنوں سری نگر میں غلام رسول مہر نام کے ایک صاحب ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ قلم بند کررہے تھے، ان کے ساتھ وہ کئی تاریخی مقامات کی سیاحت کے لیے گئی تھیں۔ مظہر امام کے گھر پر ایک طویل نشست ہوئی تھی جس میں عینی آپا نے سیکولرزم کے پس منظر میں کشمیر پر کچھ لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ میرے ساتھ اس موضوع پر کھل کر گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن میرا خیال ہے، مظہر امام کے ساتھ اس بارے میں انھوں نے طویل گفتگو کی تھی۔ وہ بھی عینی آپا کے دورۂ کشمیر کے حوالے سے ضرور کچھ ایسی باتیں معرضِ تحریر میں لاسکتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ ہوں گی اور مفید بھی۔ حسن نعیم کی نظم قندِ مکرر ہونے کے باوجود تازگی اور کشش کے اعتبار سے آج بھی نئی ہے۔

■ **اقبال نیازی، 40/18، غریب حسین ہاؤس، قریش نگر، کرلا (ایسٹ)، ممبئی-400070**

"اردو دنیا" پابندی سے مل رہا ہے۔ اس بار قرۃ العین حیدر والا گوشہ بے حد وقیع ہے اور عام مشمولات نہایت سلیقے سے ترتیب دیے گئے ہیں بالخصوص ان کی وہ کہانیاں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں انھیں پڑھ کر مزہ آیا۔

■ **گیان چند نائر، ایٹ/پوسٹ، برداہا، کسول، مدھوبنی، بہار-847304**

"اردو دنیا" برابر مل رہا ہے۔ اس کے مضامین نئے زمانے اور نئے ماحول کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے اس کی پذیرائی ہر طرف ہورہی ہے۔ آپ اردو والوں کے لیے ایک بڑا کام کررہے ہیں خاص طور سے آپ نے جس وسیع پیمانے پر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے آپ کی فعال رہنما شخصیت کا ثبوت ملتا ہے۔ خدا آپ کے ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے اور

آپ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

1857 کی جنگ آزادی کے 150 سال پورے ہونے پر جگہ جگہ سیمینار اور مذاکرے وغیرہ ہو رہے ہیں۔ اردو کے تمام رسائل بھی اس پر مضامین شائع کر رہے ہیں۔ ''اردو دنیا'' میں بھی اس طرح کے کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یہ سب آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

■ **نذیر احمد یوسفی، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول-2**

''اردو دنیا'' کی نئی روش نیک فال ہے اب اس کی خشکی کم ہوئی ہے اور پڑھنے میں طبیعت لگ رہی ہے۔ گوناگوں عنوانات کے تحت مختلف مضامین ہر ماہ آپ ہم قارئین کے لیے پیش فرما رہے ہیں جو قابلِ ستائش ہے۔ کتابوں پر تبصرے گوکہ مختصر ہیں لیکن جان دار ہیں۔

■ **شبیر آذر، 392، ایم آئی جی، ہاؤسنگ کالونی، بے مینا قمرواری، سری نگر**

''اردو دنیا'' کا ستمبر کا شمارہ بہت بھرپور ہے تعلیم و زبان، علم و ادب، تاریخ و ثقافت، ماحولیات، صحت، سائنس، مطبوعات سے متعلق جانکاری اور بچوں کا گوشہ غرض قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر لذیذ نعمتیں فراہم کی گئیں ہیں جن کا چٹخارہ دیر تک محظوظ کرتا ہے۔ ''ہماری بات'' عنوان کے تحت آپ کا اداریہ مفکرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خلوص و شفافیت کا مظہر ہے۔ ''آپ کی بات'' عنوان کے تحت خطوط کا کالم بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطوط صرف مدیر اور جریدے کی تعریف و توصیف پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں تنقیدی شعور کے پر تو قارئین کو محظوظ کرتے ہیں اور ان کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا سلسلۂ مضامین ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' طلبہ کے لیے خاص طور سے نسخۂ کیمیا ہے۔

■ **رضوان خان، 98 شیخ سرائے، سیتاپور- 261001**

''اردو دنیا'' ستمبر 2007 باصرہ نواز ہوا۔ اداریہ بہت ہی اچھا ہے۔ آپ نے اردو رسم الخط کو موجودہ شکل میں رکھنے کے حق میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان تمام لوگوں کے منھ بند کرنے کے لیے کافی ہیں جو اس خوبصورت زبان کے خوبصورت رسم الخط کو تبدیل کرنے کی بے تکی بات کرتے ہیں۔ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ رسم الخط لباس نہیں ہے کہ اسے تبدیل کرلیا جائے۔ عربی، فارسی اور اردو رسم الخط اتنے حسین اور دلکش ہیں کہ ان کو مصوری کے نزدیک مانا جاتا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کردیا جائے حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسی باتیں کرنے والے یا تو اردو کے کھلے دشمن ہیں، یا اس شوشے کو اچھال کر اردو دشمن طاقتوں کے منظورِ نظر بن کر کچھ انعام و اکرام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ ایسے لوگ ہمیشہ منھ کی کھائیں گے اور اردو اپنے اسی رسم الخط کے ساتھ زندہ و تابندہ رہے گی۔ ستمبر کے شمارے میں دیگر مضامین بھی بہت عمدہ ہیں۔ خبرنامہ بھی نہایت معلوماتی ہے۔

■ **سید اطہر، اختر منزل، اعظم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد- 431001 (مہاراشٹرا)**

ماہنامہ اردو دنیا کا ستمبر 2007 کا شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے جب سے اس رسالے کی ادارت سنبھالی ہے اس کے معیار میں واضح طور پر ترقی ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ہمارا مقبول ماہنامہ اسی طرح دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہے گا۔

اردو پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے سلسلہ وار مضامین نہایت مفید اور معلوماتی ہیں۔ جھوٹ میں سچ جناب عبدالماجد دریابادی کی بادۂ کہنہ بے حد سرور بخش ہے۔ مشاہیر اہل قلم کی تخلیقات اسی طرح شاملِ اشاعت رہیں تو بہتر ہوگا۔ صحت، سائنس اور ماحولیات کا شعبہ اس مرتبہ بڑا جاندار ہے۔ احمد فراز سے بات چیت کافی دلچسپ ہے۔ ہمیں اعتماد ہے کہ مخمور سعیدی اور آپ اسی طرح اردو کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔

■ **شریف الدین خاں، 14/1958، نزد یونیورسٹی امناکا، رائے پور (سی جی) 492010**

''اردو دنیا'' ستمبر کے شمارے میں ''آپ کی بات'' کے کالم میں میرا ایک خط شائع ہوا۔ اس خط کے ردِ عمل میں کئی ٹیلیفون اور خطوط آئے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک خط پر اتنے تاثرات آئیں گے۔ ان میں ایک خط مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کے ڈائرکٹر صاحب کا بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسالہ لوگ کتنے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کی رسائی کہاں تک ہے۔ افسانوں، نظموں، غزلوں اور مضامین پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں مگر ایک خط پر اظہارِ خیال معنی رکھتا ہے۔

مذکورہ خط درج ذیل ہے۔

'' آپ کا خط ''اردو دنیا'' کے اگست کے شمارے میں پڑھا۔ یہ جان کر بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ راج نندگاؤں کے مدرسے میں تقریباً تین سو بچے زیرِ تعلیم ہیں جن میں پچاسی طلبہ ایسے ہیں جو کہ غیر مسلم ہونے کے باوجود اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہم مبارکباد دینا چاہیں گے وہاں کے انتظامیہ اور طلبہ کو، اگر کچھ لوگ اسی طرح مثبت طریقے سے اردو کی خدمت کرنا چاہیں تو یقیناً اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہوگا۔

''اس سلسلے میں ہم آپ سے تعاون چاہیں گے کہ اگر آپ مدرسے کا مکمل پتا عنایت فرمائیں تو نوازش ہوگی تاکہ ہم ان کے ذوق کی کچھ کتابیں بطور عطیہ بھجوا سکیں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ —ہمایوں ظفر زیدی''

□□□

ہماری بات

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کی سرحدیں بہت پھیلی ہوئی ہیں اور براعظم ایشیا کے ایک بڑے رقبے کا احاطہ کرتی ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں جس کی آبادی کروڑوں میں ہے تنوع اور رنگارنگی کا پایا جانا قدرتی ہے۔ ہندوستان کو ایک ایسے خوش نما باغ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو رنگ رنگ کے پھولوں سے مہکتا رہا ہے اور جس کی کھلی فضا میں لہلہاتے درختوں پر خوش الحان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی اپنی زبان میں نغمہ سرا ہیں۔ یہ رسیلی بولیاں اور دلوں میں مٹھاس بن کر اتر جانے والی زبانیں کثرت میں وحدت اور انیکتا میں ایکتا کا ایسا سنگیت ہیں جس نے تمام ہندوستانیوں کو اتحاد و اتفاق کی ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ ہندوستان کی سلامتی اسی میں ہے کہ یہ ڈور مستحکم رہے، کبھی کمزور نہ ہو۔

ہندوستان کی کوئی زبان یا کوئی بولی ہو اس میں ہندوستان کا دل دھڑک رہا ہے اور اس وشال دیش کی آتما بول رہی ہے۔ یہاں کے سادھو سنت ہوں، پیر فقیر ہوں یا ادیب اور شاعر سب نے انسانی اخوت و محبت پر زور دیا ہے اور نسلی اور سماجی درجہ بندی نیز مذہبی اور لسانی اختلافات سے اوپر اٹھ کر زندگی کرنے کا درس دیا ہے۔ ہمارے دور میں سیاسی سطح پر بقائے باہم کے جس نظریے کو پنڈت نہرو نے متعارف کرایا، اس کی جڑیں رواداری کی اسی زمین میں پیوست تھیں جو ہمارے بزرگوں نے تیار کی تھی۔

اردو ہندوستان کی ان زبانوں میں ہے جس کی بنیاد ہی الگ الگ عقیدوں کے ماننے والوں، الگ الگ تہذیبی پس منظر رکھنے والوں اور الگ الگ زبانیں بولنے والوں کے باہمی روابط اور آپسی میل جول پر قائم ہوئی۔ عربی، فارسی اور ترکی سے قطع نظر جن کے زیر اثر اردو کے مزاج میں پاکیزگی اور نفاست آئی، اس نے ہندوستان کی سبھی زبانوں سے کچھ نہ کچھ لیا ہے اور انھیں کچھ نہ کچھ دیا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہندوستان کے کسی گوشے میں ہوں، دور و نزدیک کے کسی شہر یا دیہات سے آپ کا گزر ہو، آپ کی بات سمجھنے والے مل جائیں گے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور انگریزی حکومت کا قیام ایک قومی سانحہ تھا جس کے دور رس اثرات ہندوستانی زندگی پر مرتب ہوئے، بیشتر منفی لیکن کچھ مثبت بھی۔ مثبت اثرات میں سے ایک انگریزی ہے، جو اس وقت بھی دنیا کی بڑی زبانوں میں تھی، ہندوستانیوں کی شناسائی تھی۔ اس شناسائی نے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ کیا اور کچھ نئے اسالیب بیان بھی اسے حاصل ہوئے۔ شعروادب میں کچھ نئی اصناف کا بھی اضافہ ہوا مثلاً مختصر افسانہ، ناول، نظم معرا، نظم آزاد وغیرہ۔ لیکن اردو نے یہ سب کچھ اپنی شرائط پر لیا اور ردّ و قبول کی کسوٹی پر پرکھ کر۔

اردو اور ہندی دو سگی بہنوں کی طرح ہیں، دونوں ایک ہی لسانی گھرانے میں پیدا ہوئیں، دونوں کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ ایک سا ہے، مصادر مشترک ہیں اور عام بول چال کے الفاظ میں بھی زیادہ اختلاف نہیں۔ لہٰذا ان میں باہمی لین دین قدرتی بھی ہے اور مستحسن بھی۔ ہندی میں اردو کے بہت سے لفظ دخیل ہو چکے ہیں اور صرف بول چال کی زبان میں نہیں تحریری زبان میں بھی استعمال ہو رہے ہیں۔ اردو میں بھی ہندی کے بہت سے الفاظ نے جگہ بنالی ہے اور انھیں سن کر یا پڑھ کر کسی اردو والے کو مغائرت کا احساس نہیں ہوتا۔ زندہ زبانیں جامد نہیں ہوتیں نہ اتنی بے حس کہ باہمی میل جول کا کوئی اثر قبول نہ کریں۔ لیکن اس عمل کے نتیجے میں اگر دونوں زبانوں میں سے کسی کی انفرادیت مجروح ہو، اس کی ثقافتی پہچان اور اس کا تہذیبی کردار مسخ ہونے لگے تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ان دنوں اردو اخبارات و رسائل، بالخصوص اخبارات میں ایسے جملے اور فقرے دیکھنے کو ملتے ہیں جو اردو محاورے سے دور کی نسبت بھی نہیں رکھتے اور ہندی اسالیب بیان کا چربہ ہیں۔ اخباری سرخیوں میں ہر روز آپ کو "وزیر اعظم کے ذریعے" کوئی نہ کوئی اعلان نظر آئے گا اور آپ سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے کہ یہ اعلان "وزیر اعظم کی طرف سے" کیوں نہیں۔ ہندی میں "پردھان منتری دوارا" لکھا جاتا ہے، ہم نے اس کا لفظی اردو ترجمہ "وزیر اعظم کے ذریعے" کر دیا، یہ زحمت نہیں کی کہ اس کا درست اردو متبادل تلاش کریں ـــ سرخیوں سے قطع نظر متن میں تو ہندی یا پھر مقامی نوعیت کے ایسے اسالیب بیان کچھ زیادہ ہی نظر آئیں گے جو عام ہندی بول چال سے بھی الگ ہیں۔

اپنی تمام تر فراخدلی کے باوجود کیا اردو اس مداخلت بیجا کی متحمل ہوسکے گی، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: تعزیے داری لکھنا، پڑھنا صحیح ہے یا تعزیہ داری؟

جواب: لفظ تعزیے پر امالہ کا عمل یقیناً جاری ہوتا ہے جب وہ تنہا استعمال ہو مثلاً ''میں نے ایک تعزیہ دیکھا، تعزیے میں موتی لگے ہوئے تھے۔'' لیکن ''تعزیہ داری''، مکمل فقرہ یا لفظ ہے، اس کا پہلا حصہ ''تعزیہ'' ہے اس پر امالے کا قاعدہ نہیں جاری ہوگا۔ کیوں کہ امالہ کا قاعدہ اسی الف یا الف والی آواز کے حرف پر جاری ہوتا ہے جو لفظ کے آخر میں آئے۔

سوال: لفظ ''شان'' مونث ہے مگر جب نزول کی طرف اس کی اضافت کی جاتی ہے تو مذکر استعمال ہوتا ہے، جب کہ تذکیر و تانیث میں مضاف کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

جواب: مرکب ''شان نزول'' میں بعض لوگوں نے ''شان'' کو مذکر لکھا ہے کیونکہ یہاں لفظ ''شان'' کے وہ معنی نہیں ہیں یعنی سج دھج، رونق، چال ڈھال، وغیرہ جو اردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ''شان نزول'' میں بھی ''شان'' کو مونث لکھنا اور بولنا چاہیے۔ ایک واحد مرکب فقرے کے لیے کسی لفظ کی جنس بدل دینا غیر ضروری الجھاؤ پیدا کرنا ہے۔ عام طور پر ''شان نزول'' میں ''شان'' کو مونث ہی لکھا جاتا ہے اور وہی ٹھیک ہے۔

سوال: مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ کا ایک شعر ہے

تو زندہ ہے واللہ، تو زندہ ہے واللہ
مرے چشم عالم سے چھپ جانے والے

اس شعر میں چشم کو مذکر باندھا ہے، ایسا کیوں؟

امام احمد رضا خاں کے شعر میں کوئی غلطی نہیں ہے دوسرے مصرع میں لفظ ''اے'' موجود نہیں ہے لیکن موجود قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے لفظ کو ''مقدر'' کہتے ہیں۔ چنانچہ مصرع کی نثر ہوگی: ''اے میرے چشم عالم سے چھپ جانے والے۔'' یعنی اے وہ شخص یا ذات جسے میں اپنا سمجھتا ہوں اور جو اب چشم عالم سے پوشیدہ ہے۔ یعنی اس مصرع میں ''چشم'' کا تعلق ''میرے'' سے نہیں ہے لہٰذا ''چشم'' اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، اس میں مذکر مونث کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔

(سوالات: محمد اختر السلام — المجمع الاسلامی، مبارک پور)

سوال: مندرجہ ذیل الفاظ میں قواعد کی رو سے صحیح رسم الخط کیا ہے اور کون سی ترکیب درست ہے؟

علماے کرام یا علماء کرام یا علمائے کرام۔ برائے کرم اس کی رہنمائی فرمائیں۔

جواب: جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا ہے اردو میں ''علمائے کرام'' اور اس طرح کے دوسرے الفاظ کے لیے دو ہی املا رائج ہیں۔ یا تو ''علما'' لکھ کر اس کے آگے بڑی یے لکھیے اور بڑی یے پر ہمزہ لگائیے، یا ''علما'' لکھ کر اس کے آگے بڑی یے لکھیے لیکن بڑی یے پر ہمزہ نہ لگائیے۔ بڑی یے دونوں طرح موجود رہے گی۔ اس معاملے پر میں پہلے بھی گفتگو کر چکا ہوں۔

(سوال: محمد کاشف رضا شاد — دارالعلوم رضائے مصطفےٰ، رنگ روڈ، احمد رضا کالونی، گلبرگہ)

سوال: ''درخواست'' اور ''خط'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: ''درخواست'' اور ''خط'' میں پہلا فرق تو یہی ہے کہ ''خط'' کے ساتھ لکھے جانے کی شرط ہے۔ ''درخواست'' کے ساتھ ایسی کوئی شرط نہیں۔ یعنی آپ زبانی ''درخواست'' کر سکتے ہیں لیکن زبانی ''خط'' نہیں لکھ سکتے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ''درخواست'' میں کسی چیز کی طلب یا تمنا یا تقاضا ہوتا ہے۔ ''خط'' میں ایسی کوئی شرط نہیں۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ ''خط'' اگر عربی معنی میں لیا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے ''لکیر'' اور اسی لیے اسے ''لکھائی'' کے معنی میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مردوں کے چہرے کے بالوں کو بھی ''خط'' کہتے ہیں۔ یہ سب معنی لفظ ''درخواست'' میں غیر حاضر ہیں۔

سوال: ''ملوث'' کا درست تلفظ کیا ہے؟

جواب: ''ملوث'' وغیرہ کی طرح کے بہت سے عربی اسم فاعل ہیں جو عام طور پر زبر کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ لہٰذا ''ملوث''، ''مستحق'' وغیرہ الفاظ میں تیسرے حرف پر زبر ہی قرار دیتے ہیں۔ یعنی ''ملوث'' میں واؤ پر زبر ہے۔

سوال: "معنویت" اور "معروضیت" کے کیا معنی ہیں؟

جواب: "معنویت" اور "معروضیت" نسبتاً جدید لفظ ہیں اور اردو والوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ "معنویت" کے معنی ہیں، "کسی لفظ یا عبارت یا کام یا واقعے میں معنی کا وجود ہونا، یا معنی کے وجود کی کیفیت۔" مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "فلاں کی شاعری اب اپنی معنویت کھو چکی ہے"، یا "فلاں شخص نے فلاں واقعے کی معنویت پر غور نہیں کیا۔" لفظ "معروضیت" کو اردو والے "موضوعیت" کے مخالف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ "موضوعی" بمعنی Subjective ہے۔ یعنی ایسی بات یا رائے یا تصور یا فیصلہ جو ہم نے اپنے ذاتی اور داخلی تصورات کی بنا پر قائم کیا ہو اور "معروضی" کو اردو میں Objective کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا "معروضیت" کے معنی ہوئے "کسی بات، رائے، تصور یا فیصلے وغیرہ میں ذاتی تصورات، یا تاثر کے بغیر رائے یا فیصلہ قائم کرنا یا بات کرنا"۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "فلاں نے جب ایک فریق کو اپنا دوست قرار دیا ہے تو اس کے فیصلے میں "معروضیت" کہاں سے آئے گی؟"

(سوالات: نازش عمر انصاری—چھا آباد کنٹراس گڑھ، دھنباد، جھارکھنڈ)

سوال: وہ چوتھی منزل پر رہتا ہے یا وہ چوتھے منزلہ پر رہتا ہے۔ ان میں کیا صحیح ہے؟

جواب: اردو میں عمارت کے درجے کے لیے لفظ "منزل" استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً "میں چوتھی منزل پر رہتا ہوں"، یا "اس عمارت میں اٹھارہ منزلیں ہیں۔" اسی سے لفظ "منزلہ" بنایا گیا، جو صفاتی معنی رکھتا ہے مثلاً "چار منزلہ عمارت" یعنی اس عمارت میں چار منزلیں ہیں۔ لفظ "منزلہ" کو لفظ "منزل" کے، یعنی عمارت کے درجے کے معنی میں استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ استعمال ممبئی اور اس کے اطراف میں ضرور سنا جاتا ہے۔ وہاں اس لفظ "منزلہ" کو مراٹھی کے لفظ "مالا" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں یعنی وہ "چوتھے مالے پر رہتا ہے/ وہ چوتھے منزلے پر رہتا ہے۔" ابھی اسے اردو کا معیاری استعمال نہیں کہہ سکتے۔

سوال: وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا یا وہ اچھے نمبرات سے پاس ہو گیا۔ کیا صحیح ہے؟

جواب: نمبر (Number) یہ انگریزی لفظ اب اردو میں داخل ہو گیا ہے اور عام طور پر اس کی جمع "نمبروں" مستعمل ہے۔ پہلے "نمبر" کے بجائے "لمبر" بولتے تھے اور اب بھی یہ تلفظ کہیں کہیں سننے میں آتا ہے۔ "نمبر" کی جمع "نمبرات" دکن میں (اور ممکن ہے مہاراشٹرا میں بھی) بول چال میں رائج ہے۔ لہٰذا اسے دکن/مہاراشٹرا کا مقامی صرف کہہ سکتے ہیں۔ میں خود یہ لفظ نہیں لکھتا ہوں لیکن اگر کوئی لکھے تو اسے منع بھی نہیں کروں گا۔

سوال: تمام اسکول گرمی کی تعطیل کے بعد کھل گئے ہیں۔ یا تمام اسکولیں گرمی کی چھٹی کے بعد کھل گئی ہیں۔ کیا صحیح ہے؟

جواب: اردو میں "اسکول" کو ہمیشہ مذکر لکھا اور بولا جاتا ہے اسے مونث قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

سوال: مندرجہ ذیل الفاظ کا صحیح تلفظ کیا ہے؟

خواتین، دسترخوان، سوال، برہمن، ہندوستان۔

جواب: "خواتین" میں خ پر زبر اور واؤ صاف بولا جائے گا۔ بر وزن "قوانین"۔ "دسترخوان" میں خ پر زبر اور واؤ نہیں بولا جائے گا۔ ایسے واؤ کو واؤ معدولہ کہتے ہیں یعنی وہ واؤ جو دبا کر برابر کر دیا جائے۔ لہٰذا "دسترخوان" بروزن "آغا خان" بولا جائے گا۔ "سوال" میں اردو کے مروج تلفظ کے اعتبار سے س پر زبر ہے۔ کہیں کہیں لوگ عربی کی تقلید میں س پر پیش بولتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے، جو تلفظ اردو میں رائج ہے وہی ٹھیک مانا جائے گا یعنی س پر زبر۔ "برہمن" بروزن فعولن بھی ٹھیک ہے اور "برہمن" بروزن فاعلن بھی ٹھیک ہے لیکن عام بول چال میں "برہمن" بروزن فعولن ہی مستعمل ہے۔ شاعری میں "برہمن" بروزن فاعلن بھی بے تکلف برتا جاتا ہے۔ "ہندوستان" کے تلفظ اور املا دونوں میں واؤ صاف سنائی دیتا اور لکھا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے لفظ "ہندوستان" میں واؤ نہ لگانے کی تجویز کی ہے لیکن یہ نہ کسی قاعدے کے لحاظ سے درست ہے اور نہ رواج عام کے لحاظ سے۔ پہلے زمانے میں "ہندو" اسے کہتے تھے جو ملک ہند کا رہنے والا ہو۔ اس پر "ستان" کا لاحقہ لگا کر ہندوستان بنا دیا گیا اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جیسے "عرب" سے "عربستان"، "افغان" سے "افغانستان" وغیرہ۔ "ہندوستان" کو شاعری میں مفعولات کے وزن پر بھی لکھ اور پڑھ دیا جاتا ہے لیکن اس سے لفظ کا اصل املا نہیں بدلتا۔

سوال: اردو میں مندرجہ ذیل حروف کن آوازوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟

(الف) ت۔ ط جیسے تعریف، طریقہ

(ب) ث۔س۔ص جیسے مثلث، آس، مصیبت

(ج) ح۔ہ جیسے حیرت، ہمت

(د) ذ۔ز۔ض۔ظ جیسے ذکی، زیادہ، مرض، ظرف

(ہ) آ۔عا جیسے آم، عام

جواب: اردو کی حد تک ت اور ط کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح ث، س، ص کے تلفظ میں بھی کوئی فرق نہیں۔ بڑی ح اور چھوٹی ہ کے تلفظ میں بھی کوئی فرق نہیں، لیکن بعض شعرا لفظ کے آخر میں آنے والی بڑی ح کو چھوٹی ہ کے برابر نہیں مانتے۔ یعنی لفظ کے آخر میں آنے والی بڑی ح کو اس طرح نظم کرتے ہیں گویا وہ بڑی ح نہیں بلکہ خ ہو، یعنی وہ صاف سنائی دیتی ہو۔ عام تلفظ کے اعتبار سے دونوں کی آواز ایک ہے۔

ذ، ز، ض، ظ وغیرہ کے تلفظ کا استعمال بھی اردو میں بالکل ایک ہی طرح کیا جاتا ہے۔

ع اور الف کے تلفظ میں بھی اردو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ بہت سے شعرا ع کو الف کی طرح ہلکا کر کے نظم نہیں کرتے۔ یعنی وہ ع کو اس طرح نظم کرتے ہیں کہ وہ ع نہیں غ ہو، یعنی اس کی آواز پوری طرح سنائی دے رہی ہو۔

میں نے آپ کے تمام سوالوں کے جواب دے دیے ہیں۔ براہ کرم آئندہ یہ خیال رکھیں کہ ایک مراسلے میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں۔ شکریہ۔

(سوالات: شہاب حیدر — ڈی. 1004، رائل کلاسک، نیو لنک روڈ، اندھیری (مغرب) ممبئی-400053

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-एउर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066.

Ph.: 26109746, 26169416 Fax:26108159, E-mail: urducouncil@rediffmail.com

پونہ کتاب میلہ

تاریخ : 05 تا 09 دسمبر 2007

وقت : 10 بجے دن سے شام 8 بجے تک

مقام : گنیش کلا منچ، نہرو اسٹیڈیم، پونہ

قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے، جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس و تکنولوجی، بچوں کا ادب، (CBT in Urdu) طب و معالجات

افتخار عالم خاں

سرسید کی جدید، لبرل اور سائنسی طرز فکر

سرسید عہد وسطیٰ کی طرز تعلیم اور تربیت کے پروردہ ہونے کے باوجود ایک جدید، لبرل اور عقلیت پسند انسان تھے۔ وہ جدید بینکنگ سسٹم کے قائل تھے اور شدید مخالفت کے باوجود بینک میں روپیہ رکھتے تھے۔ پرومیسری نوٹ خریدتے تھے اور ان پر ملنے والے سود کو جائز سمجھتے تھے۔ انھوں نے کالج کے چندے کے لیے لاٹری بھی ڈالی تھی جسے ان کا جوا کھیلنا قرار دیا گیا تھا۔ وہ رقص و موسیقی کے سرتال سے واقف تھے۔ ان کے ماموں دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین خاں رقص و موسیقی کے شیدائی تھے۔ سرسید نے بڑی تفصیل سے ان مجلسوں کا ذکر کیا ہے جن میں بی جنا دھرپت و خیال گایا کرتی تھیں اور جہاں بڑے بڑے گویے جمع ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔[1] سرسید تصویر کھنچوانے اور تصویر بنوانے دونوں کے قائل تھے۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی ان پر کافی اعتراضات کیے گئے تھے۔ سرجان اسٹریچی کی اہلیہ نے (جو ایک عمدہ آرٹسٹ تھیں) سرسید کا ایک روغنی پورٹریٹ بھی بنایا تھا۔ مسٹر تھیوڈر بیک کے 1887 میں لکھے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید اکثر الٰہ آباد جا کر پورٹریٹ کی تکمیل کی خاطر آرٹسٹ کے سامنے بیٹھتے تھے۔[2]

سرسید کی مغربی نوعیت کی آثار قدیمہ (یعنی آرکیالوجی) سے دلچسپی تو "آثار الصنادید" کی تصنیف کے وقت سے ہی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی یہ دلچسپی تا عمر قائم رہی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی میں آثار قدیمہ سے متعلق نادرات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو آج بھی سرسید کلکشن کے نام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے آرکیالوجیکل سیکشن میں موجود ہے۔ سرسید کو اے ایم او کالج میں سر ولیم میور کی یادگار کے بطور ان کا ایک مجسمہ نصب کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا جس کے لیے انھوں نے کالج فنڈ کمیٹی منعقدہ 6 جولائی 1875 میں ایک تجویز بھی منظور کروائی تھی لیکن بعد میں عام مسلمانوں کے منفی ردعمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس تجویز پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔[3]

حالانکہ سرسید نے خود طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ عرصہ ہومیو پیتھک علاج کو بھی رائج کرنے کے لیے کوشاں رہے تھے۔ لیکن بعد میں وہ ہمیشہ ایلو پیتھک طریقۂ علاج کو اپنانے کی وکالت کرتے تھے۔ زندگی میں حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کے سلسلے میں وہ بہت سے روایتی طور طریقوں کو ترک کرنے کے حق میں تھے۔ صاف ستھرا، معقول لباس زیب تن کرنے اور صحت مند کھانا، مہذب طریقہ سے تناول کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ مغربی معاشرت کے طور طریقوں کے سلسلے میں عام لوگ جس طرح کے متعصب رویوں کو روا رکھتے تھے۔ سرسید اس کے مخالف تھے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ۔

"مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں اور طریقۂ زندگی، گو وہ کیسا ہی بے عیب ہو، اختیار کرنا، صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔"[4]

وہ خود مغربی لباس زیب تن کرتے تھے اور ہمیشہ میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے تھے اور اس سلسلے میں کہتے تھے کہ:

"مگر انصاف سے ہمیں اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ چھری چمچہ سے کھانا بہ نسبت ہاتھ سے کھانا کھانے کے زیادہ عمدگی و صفائی اور نفاست رکھتا ہے۔"[5]

مذہبی معاملات میں سرسید روایت پرستی اور اندھی تقلید کے مخالف تھے۔ وہ مذہبی اعتقادات کو زمانے کے تغیرات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی غمازی کرتے تھے۔ "وہ اپنے مقالے 'زمانے کا اثر مذہب پر' میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"جس طرح دنیاوی خیالات و عادات اور رسم و رواج، حالت تمدن اور معاشرت پر زمانہ موثر ہوتا ہے۔ اس طرح مذہب و اعتقاد پر بھی زمانے کا اثر پڑتا ہے۔ ایک زمانہ 'یقین' کا زمانہ کہلاتا ہے کہ جو بات کہی جاتی ہے گو وہ کیسی ہی عجیب ہو، اس پر سب کو یقین ہوتا ہے۔ مگر حال کا زمانہ وہ زمانہ نہیں ہے۔ بلکہ شک کا زمانہ ہے۔ کوئی بات ہو جب تک اس کے سچ ہونے کا یقین نہ آوے، سچ نہیں مانی جاتی۔"[6]

مذہبی معاملات میں بھی وہ کھلے ذہن سے سوچنے کے عادی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح وقت کے ساتھ انسانی معاشرت میں تغیر ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں بھی تبدل واقع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ:

"جس طرح قدیم و جدید فلسفہ کے اصول میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی طرح مذہبی اصول قدیم و جدید میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔"

قدیم اصول مذہبی یہ ہے کہ انسان مذہب کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جدید

اصول یہ ہے کہ مذہب انسان کے لیے پیدا ہوا ہے۔

قدیم اصول یہ ہے کہ خدا کو اندھیری رات میں آنکھ بند کر کے ڈھونڈھنا چاہیے۔ جدید اصول یہ ہے کہ خدا کو آنکھیں کھول کر روشنی میں اور موجودات پر توجہ کر کے ڈھونڈھنا چاہیے۔"(7)

سرسید توہم پرستی، خاص طور پر کرامات، معجزات اور عجائبات سے یکسر منحرف تھے۔ بلکہ ان کا کہنا تھا کہ:

"انسان کے ذہن اور دنیا اور تمدن اور معاشرت، بلکہ زندگی کی کل حالت کو، کرامت اور معجزہ پر یقین یا اعتقاد رکھنے سے زیادہ خراب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔"(8)

وہ مسلم بین الاقوامیت یا بین الاقوامی اسلامی اتحاد کے منکر تھے۔ وہ خلافت اور خلیفہ کے نظریہ کو متروک سمجھتے تھے انھوں نے اپنے مضمون بعنوان "امام اور امامت" میں واضح کیا ہے کہ:

"موجودہ زمانے کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو امامت کا رتبہ رکھتا ہو اور نہ کوئی شخص، گو کہ وہ کسی ملک کا حاکم بھی ہو، ایسا ہے جو خلیفۂ رسول اللہ کہلانے کا مستحق ہو۔ البتہ جو مسلمان کسی ملک پر حکومت رکھتے ہیں وہ اس ملک کے سلطان کہلانے کے مستحق ہیں اور درحقیقت وہ اس ملک کے ہی سلطان ہیں۔ گو انھوں نے اپنے تئیں کسی لقب سے ملقب کیا ہو۔"(9)

وہ مذہب اور سائنس کے درمیان کسی قسم کے تضاد سے انکار کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب "ورڈ آف گاڈ" ہے اور ہمارے آس پاس کے موجودات "ورک آف گاڈ" ہیں۔ انھیں موجودات کا علم ہی سائنس کہلاتی ہے۔ اس لیے سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہے کیونکہ خدا کے کلام اور خدا کے کام میں کوئی تضاد کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر سائنس اور مذہب میں کسی کو کوئی تضاد نظر آتا ہے تو یہ اس کی سمجھ کا قصور گردانا جائے گا۔ اس لیے ہم کو اپنی سمجھ درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔(10)

وہ مذہبی معاملات میں رواداری، تحمل اور برداشت کے قایل تھے اور ہمیشہ مذہبی رواداری کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"حقیقت میں غیر مذہب والوں کے پیشواؤں کو برا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو برا کہنا ہے۔"(11)

سرسید سائنسی فکر اور عقلیت پسندی کا حامل ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے حتی الامکان اپنے آپ کو عصری سائنسی نظریات سے متعارف اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی عصری سائنسی نظریات کے سلسلے کی استعداد کا اندازہ ان کے اردو میں لکھے متعدد طبع زاد مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نظام شمسی کے بارے میں ایک مفصل مضمون بعنوان "دنیا کب بنی اور کتنی مدت میں" میں اس زمانے میں رائج مختلف نظریات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔(12) جیولوجی کے جدید نظریات پر مبنی ان کا ایک مضمون بعنوان "تحقیقات الارض حسب علم جیولوجی" نہایت مدلل اور مفصل ہے جس میں زمین پر جانداروں کے ارتقا کے مدارج اور مختلف جیولوجیکل طبقات جیسے پیلیوزویک (Paleozoic) میزوزویک (Mezozoic) اور سینوزویک (Cenozoic) اور ان کے ذیلی ادوار نیز ان ادوار میں موجود اشجار و دوسرے جانداروں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اس سلسلے میں تین طبقے ہیں۔ اول ڈیوونین (Devonioun) دوئم کاربونی فیرس (Carboniferous) سوئم پرمین (Permian) ان میں فرن کے جنگل اور مچھلیاں کثرت سے تھیں۔ تیسرا سلسلہ جوٹرائسک (Trisic) کہلاتا ہے اس طبقے میں رینگنے والے جانور پائے جاتے تھے۔ بیج والے درخت بھی موجود تھے "پلےسی اوسارس" اور "اِک تھائی اوسارس" اور بڑے بڑے بدشکل پانی کے جانور پائے جاتے تھے۔ زمین کے بڑے بڑے جانور جیسے "ڈائنوسارس" میدانوں میں پائے جاتے تھے۔(13)

اسی مضمون میں انسان کے ارتقا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"انسان کے وجود کا پتہ ادنیٰ حالت میں "ٹرشری" زمانے میں پایا جاتا ہے اور ڈھائی لاکھ برس سے اس کی عمدہ حالت کے نشان پائے جاتے ہیں اور اس کی بنائی ہوئی چیزیں پتھر اور ہڈی وغیرہ کی ملتی ہیں۔"(14)

1969-70 میں جب سرسید انگلینڈ میں تھے اس وقت چارلس ڈارون زندہ تھے اور ان کی Origin of Species شائع ہوچکی تھی اور عام بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ ڈارون کی مخالفت اور ان کا مذاق اڑانے والوں میں چرچ سے متعلق بنیاد پرستی کے حامل لوگ پیش پیش تھے۔ سرسید نے بھی اس عام بحث میں دلچسپی لی تھی جس کے نتیجے میں انھوں نے اردو میں ایک مفصل مضمون بعنوان "ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت پر انسان کی ترقی" شائع کیا تھا۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے انسان کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقا کے سلسلے میں مذہبی عقاید پہ مبنی "الٰہی تخلیق" Divinecreation یا تخلیق خودرویدگی یعنی Spontaneous creation کے نظریات کی بہت حد تک نفی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"ہم اس کے دعوے دار نہیں کہ تمام اشجار اور حیوانات مع اپنی تمام انواع و اقسام کے دفعتاً "واحدۃ" ایک ساتھ پیدا ہوگئے ہیں۔ بلکہ ہم کو معلوم نہیں کہ کس قدر زمانہ میں یہ سلسلہ مماثلت ظہور میں آیا ہے۔ مگر ہم اس بات کے تسلیم

کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس سلسلے مماثلت میں جو سب سے اول ہے وہ پہلے وجود میں آیا ہے اور اس کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا اور علیٰ ھٰذا القیاس۔''(15)

سرسید کا یہ مضمون اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ سرسید اپنے عصر کو سائنسی دانشورانہ جستجو اور انکشافات کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ بغیر کسی مذہبی تعصب کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور عقلیت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد انھیں صداقت کو قبول کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ ہم اخیر میں اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرنا چاہیں گے۔ کہ آج مذہبی بنیاد پرستی اور تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے اس دور میں سرسید جیسے مذہبی رواداری کے حامل، لبرل اور وسیع القلب اور کشادہ ذہن رکھنے والے مصلح قوم کی ضرورت سختی سے محسوس کی جارہی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرز فکر اور ان کی تحریریں آج بھی ہماری رہبری کر سکتی ہیں۔

(نوٹ: 26 اکتوبر کو علی گڑھ الورمنائی ایسوسی ایشن (لندن) کی طرف سے منعقد کیے جانے والے سیمینار میں پیش کرنے کے لیے یہ مقالہ تیار کیا گیا ہے)

حوالہ جات:

1. سیرت فریدیہ مصنف، سید احمد خاں، مرتب محمد احمد برکاتی، پاک اکیڈمی (1964) ص-130
2. مسٹر تھیوڈر بک کا خط بنام سرسید، 1886، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
3. سرسید کا خط بنام سر ولیم میور، مورخہ 6 مئی 1875، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
4. رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات، مقالات سرسید (جلد 5) مرتب، محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص-31
5. طریقۂ زندگی، مصنف، سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، بابت 13 جمادی الثانی 1288ھ مولانا آزاد لائبریری۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ، ص-39
6. زمانہ کا اثر مذہب پر۔ مصنف، سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، یکم شوال، 1311ھ، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص-14
7. مذہبی خیال (زمانہ قدیم اور زمانہ جدید کا) مقالات سرسید، (حصہ 3) مرتب محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1961 ص-23
8. کرامت اور معجزہ، مصنف، سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، بابت 1296، ص-30-33
9. امام اور امامت، مقالات سرسید، (حصہ اول) مرتب مولانا اسماعیل پانی پتی، (مجلس ترقی ادب لاہور، 1962) ص-170
10. قرآن مجید کی تفسیر، مقالات سرسید، (حصہ دوم) محسن الملک کے خط کا جواب از طرف سید احمد خاں، ص-56
11. غیر مذہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہیے۔ مقالات سرسید، مرتب مولانا اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور (1962) ص-184
12. دنیا کب بنی اور کتنی مدت میں، مقالات سرسید (حصہ 4) مرتب محمد اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور (1962) ص-12
13. نقشہ تحقیقات طبقات الارض، حسب علم جیولوجی، مقالات سرسید، (حصہ 4) مرتب محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور (1962) ص-12
14. ایضاً، ص-14
15. ''ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت پر انسان کی ترقی''۔ مقالات سرسید، (حصہ 4) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور (1962) ص-4

□□□

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ رہا تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

شاہد پرویز

اردو صحافت کا ابتدائی دور

ملک اور سماج کو راہ راست دکھانے کی سب سے بڑی ذمے داری صحافت کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزی صحافت کا آغاز 1780 میں ہوا جس کے بعد ہندوستان کی دیسی زبانوں میں صحافت کی داغ بیل پڑی جام جہاں نما (1822) کو اردو کا پہلا اخبار کہا جاتا ہے جو کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس ہفتہ وار اخبار میں شہروں کے نام کے ساتھ وہاں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ چھ شماروں کے بعد اس کی زبان فارسی ہوگئی کیونکہ دور مغلیہ کی سرکاری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے اس کی مقبولیت زیادہ تھی۔ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بعد 1830 میں اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں فورٹ ولیم کالج نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب سر چارلس مٹکاف نے ہندوستان کے اخباروں کو مختلف پابندیوں سے آزاد کردیا تو ہندوستانی زبانوں میں کئی اخبار نکلنے لگے جن میں سرفہرست اردو ہی کے اخبار تھے۔ لیتھو کی سستی چھپائی اور ٹائپ کے مقابلے میں خوش نویسوں کی نستعلیق کتابت کی وجہ سے اردو اخبار کم قیمت پر دستیاب ہوتے تھے۔ اردو صحافت کی ترقی کی ایک وجہ اردو کا سرکاری زبان ہونا تھا۔ اردو اخباروں میں مغربی علوم کی اشاعت بھی ہوتی تھی، جس کی وجہ سے سرکار خاصی تعداد میں اردو اخبارات اسکولوں، کالجوں اور انتظامیہ کو فراہم کراتی تھی۔

اردو اخبارات یوں تو ہندوستان کے مختلف شہروں سے نکلتے تھے لیکن اردو صحافت کے دو مراکز کافی اہم رہے۔ یعنی دہلی اور لاہور۔ مولوی محمد باقر دہلوی کو اردو صحافت کا معمار اول کہا جاتا ہے۔ انھوں نے دہلی اردو اخبار کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔ اس میں 'حضور والا' کے عنوان سے مغل تاجدار کا روزنامچہ درج کیا جاتا تھا اور کمپنی بہادر کی سرگرمیاں بھی۔ اس اخبار میں برصغیر کے کونے کونے سے خبریں حاصل کرکے شائع کی جاتی تھیں۔ لوگ معاوضہ لے کر یا رضاکارانہ طور پر اس اخبار کے لیے کالم نگاری کرتے تھے۔ خبریں سیاسی، تعلیمی، تمدنی، مجلسی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ اخبار اپنے بے لاگ تبصروں کے لیے مشہور تھا۔ اس اخبار میں پولس والوں کی نااہلی کے خلاف اکثر لکھا جاتا تھا۔ ہندو مسلم تنازعات پر نہایت غیر جانب دارانہ خبریں چھپتی تھیں۔ اخبار تعلیم کا زبردست حامی تھا اور تعلیمی اداروں کی خبریں بطور خاص شائع کرتا تھا۔ اس میں تخلیقی ادب بھی خوب چھپتا تھا۔ مرزا سلمان شکوہ کے زیر اہتمام اگست 1852 کے مشاعرے کی تفصیل بھی اس اخبار میں شائع ہوئی۔ غالب نے اس مشاعرے میں اپنی وہ مشہور غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

"دہلی اردو اخبار" کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے سلیس اور بامحاورہ زبان نہ صرف استعمال کی بلکہ اس کو فروغ بھی دیا اور اس کی وکالت بھی کی۔ اس اخبار کے ذریعے اردو ادب کے ذوق و شوق کو بھی تقویت پہنچی۔ اخبار نے 1857 کے انقلاب میں انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر پُرتحسین انداز میں انقلابیوں کی خبریں چھاپتے تھے۔ بغاوت کے ناکام ہوجانے پر انگریزوں نے جب باغیوں اور ان کے حامیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا تو انھیں بھی گولی ماردی گئی اور "دہلی اردو اخبار" بند ہوگیا۔ مولوی باقر نے اکتوبر 1843 میں "مظہر الحق" کے نام سے ایک اور اردو اخبار بھی نکالا تھا جس میں زیادہ تر "دہلی اردو اخبار" کے مضامین ہوتے تھے۔ اس کے مدیر کے طور پر شیخ امداد حسین کا نام دیا جاتا تھا۔

دہلی سے نکلنے والے دوسرے اخباروں میں ایک اہم نام "سید الاخبار" کا ہے۔ اس ہفت روزہ اخبار کو سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نکالتے تھے۔ اخبار قانونی مسائل پر روشنی ڈالنے کی وجہ سے وکیلوں میں زیادہ مقبول تھا۔ مولوی محمد باقر سے چپقلش ہونے کی وجہ سے غالب اسے ناپسند کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے بھائی کی موت کے بعد اخبار کی ذمے داری سنبھالی اس کے زیادہ تر مضامین وہ خود لکھا کرتے تھے۔ یہ اخبار بعض مجبوریوں کی وجہ سے 1850 میں بند ہوگیا۔ مولوی جمیل احمد خاں نے "صادق الاخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو کافی مشہور ہوا۔ مولوی کریم الدین "کریم الاخبار" کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ وہ مشہور عالم اور ادیب تھے اور مولف اور مترجم بھی لیکن یہ اخبار تین برس بعد 1858 میں بند ہوگیا۔

پنجاب میں لاہور شہر سے سب سے زیادہ اخبار شائع ہوا کرتے تھے، ان میں "کوہ نور" اور "دریائے نور" خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ "کوہ نور" 1850 میں جاری ہوا جس کے چھ ماہ بعد "دریائے نور" نکلا جسے لاہور میں اردو کا پہلا آزاد اخبار شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں پولس حکام کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا جاتا تھا

اورنظم ونسق پر بھی نکتہ چینی ہوتی تھی جس کی وجہ سے اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہوسکی۔ دہلی اور لاہور کے علاوہ سیالکوٹ، ملتان، آگرہ، لکھنؤ، مدراس، کلکتہ، بھوپال، ممبئی حیدرآباد وغیرہ سے بھی اردو اخبار شائع ہوتے تھے۔

اردو صحافت کا مقصد خبریں بہم پہنچانا اور علم خصوصاً مغربی علوم کو فروغ دینا تھا لیکن جب ان میں خبروں کا حصہ بڑھنے لگا تو علمی اور ادبی رسالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''خیرخواہ ہند'' اردو کا پہلا رسالہ تھا جسے 1837 میں مرزاپور سے پادری آر سی ماتھر نے اپنی ادارت میں شروع کیا۔ اس میں اردو اور رومن رسم الخط میں اردو مضامین شائع ہوتے تھے۔ رسالے کے بند ہونے کے چند سال بعد 1861 میں اس کا دوبارہ احیا ہوا اور یہ ناگری اور اردو رسم الخط میں چھپنے لگا۔ 1860 میں ''خیرخواہ ہند'' میں چھپے معلوماتی مضامین کے الگ سے دو مجموعے ''منتخب العلم'' اور ''مفرح القلوب'' ناموں سے شائع ہوئے جن میں دوخانی جہازوں، بھاپ کے کل پرزوں، سرنگوں، چھاپہ خانوں، لیتھو طریق طباعت اور متعدد ملکوں کے پرانے باشندوں کے حالات پر مضامین شامل تھے۔

اس دور میں اردو میں علمی اور ادبی صحافت کے تین مرکز بن گئے تھے، دہلی، لاہور اور آگرہ۔ دہلی میں اردو کے ادبی اور علمی رسالے اور اخبار، دہلی کالج کے زیر اہتمام چھپتے تھے اور آگرہ میں آگرہ کالج سرگرم تھا، البتہ لاہور میں علمی صحافت کا آغاز نجی سرمائے سے ہوا کیونکہ وہاں کوئی سرکاری کالج نہیں تھا۔ دہلی کے مشہور رسالے ''قران السعدین''، ''محب ہند''، ''فوائد الناظرین'' اور ''تحفۃ الحدائق'' تھے۔ ''قران السعدین'' کے مدیر دہلی کالج کے سینئر اسکالر پنڈت دھرم نارائن تھے اور ''فوائد الناظرین'' کے مدیر ماسٹر رام چندر تھے۔ ماسٹر رام چندر نے 1847 میں ''محب الہند'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ یہ سب علمی رسالے تھے جن میں کچھ خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ منشی دیوان چند نے ''رہنمائے بے بہا'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ 1853 میں لاہور سے جاری کیا۔ اس میں سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ محمد احسن کالوری کے زیر ادارت یکم جولائی 1854 کو لاہور ہی سے ایک ماہنامہ ''معلم ہند'' بھی جاری ہوا۔ اسے ایک تعلیمی رسالہ کہا جاسکتا ہے۔

تقریباً یہی وہ زمانہ بھی تھا جب اردو میں ایسے رسالے نکلے جن کا مقصد شعروشاعری کو فروغ دینا تھا۔ اردو کا پہلا ادبی گلدستہ ''گل رعنا'' تھا جسے 1854 میں مولوی کریم الدین نے نکالا۔ اس رسالے میں مولوی کریم الدین کے گھر پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک شاعروں کا کلام شائع ہوتا تھا۔ مولوی ابوالحسن نے بھی آگرہ سے 1854 میں ''معیار الشعرا'' جاری کیا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ قانون اور طب پر بھی اردو میں رسالے نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ نومبر 1846 میں دہلی سے ''فوائد الشائقین'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری ہوا جس میں دیوانی اور فوجداری اور مال کے ضوابط اور اس سے متعلق دوسری معلومات شائع ہوتی تھیں برطانوی عدالتوں کے اہم فیصلوں کے تراجم بھی دیے جاتے تھے۔ 1856 میں آگرہ سے ایک ماہنامہ ''معدن القوانین'' جاری ہوا جس میں مقدمات کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ قارئین کو قانونی مشورے بھی دیے جاتے تھے۔ اردو اخبارات کے لیے خبروں کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ وہ قلمی اخبارات تھے جو درباروں کے سرکاری اور آزاد وقائع نگار مرتب کرتے تھے۔ انگریزی اخباروں سے بھی اکثر غیرملکی خبریں اخذ کی جاتی تھیں۔ اخبارات کے اپنے نامہ نگار بھی تھے جو اعزازی طور پر خبریں مہیا کراتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم عصر اردو فارسی اخبارات سے اپنے مطلب کی دلچسپ خبریں چن لیا کرتے تھے اور اسی حوالے سے شائع کردیتے تھے۔ یہ اخبارات پورے طور پر رائے عامہ کی ترجمانی نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ غیرملکی حاکموں سے خائف رہتے تھے اور خبریں چھاپتے وقت ان کے لیے احتیاط شرط تھی۔ وہ آزاد صحافیوں کا حشر دیکھ چکے تھے جنھیں سخت سزائیں دی گئی تھیں اور بعض کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ صحافت کو آزادی اس لیے بھی حاصل نہیں تھی کیونکہ زیادہ تر اخباروں کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر سرکاری امداد ملتی تھی۔ ''دہلی اردو اخبار'' اور ''صادق الاخبار'' بے باک اخبار تھے اور رائے عامہ کی نہایت آزادی کے ساتھ ترجمانی کرتے تھے۔ انھوں نے پولیس افسروں پر نکتہ چینی کی، قلعۂ معلی کی سازشوں کو بے نقاب کیا، برطانوی حکومت کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف لکھا اور انقلابیوں کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی خبریں شائع کیں، نتیجتاً ''دہلی اردو اخبار'' کے مدیر مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے گولی سے اڑا دیا اور ''صادق الاخبار'' کے مدیر جمال الدین کے خلاف مقدمہ چلا اور قید کی سزا سنائی گئی۔ قانون زبان بندی کے تحت زیادہ تر کارروائی اردو اور فارسی اخباروں کے خلاف ہوئی اور بیشتر بند کردیے گئے۔

1857 کے بعد اردو صحافت میں ایک نئے دور کی شروعات ہوتی ہے۔ نئے دور کے آغاز میں اخباروں کا لب ولہجہ بہت نرم اور مصلحت پسندانہ تھا۔ اخبارات کی توجہ سیاست کے بجائے مغربی علوم وفنون کی اشاعت پر مرکوز ہوگئی، کمپنی کے بعد تاج برطانیہ کے دور میں اخباروں میں ملکی مسائل پر دبی زبان میں رائے زنی کی جانے لگی۔ ''اودھ اخبار'' جسے 1869 میں منشی نول کشور نے لکھنؤ سے جاری کیا، اپنے دور کا سب سے بڑا اخبار تھا۔ یہ ہفت وار تھا جو بعد میں سرسید کے مشورے سے روزنامہ ہوگیا۔ اس اخبار کا کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا۔ اس اخبار میں مولوی غلام محمد خاں، پنڈت رتن ناتھ سرشار، احمد حسن شوکت اور عبدالحلیم شرر وغیرہ جیسے ادیب، شاعر اور انشاپرداز کام کرتے تھے۔ اس میں قومی اور بین الاقوامی خبروں کے علاوہ معاشی اور معاشرتی

موضوعات پر مضمون چھپتے تھے۔ علمی اور فنی موضوعات اور صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کے لیے معلوماتی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں پنچ اخبارات کے بھی بہت چرچے تھے۔ یہ مزاحیہ نوعیت کے اخبار تھے جن میں ''اودھ پنچ'' زیادہ نمایاں تھا۔ رتن ناتھ سرشار اور ان کا ''فسانۂ آزاد'' اس اخبار کی جان سمجھے جاتے تھے۔

1857 کے بعد مسلمان مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ صحافت بھی ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی، اس بات کا اندازہ انقلاب کے بعد کے بارہ اردو اخباروں سے لگایا جاسکتا ہے جن میں صرف ایک اخبار کا مدیر مسلمان تھا۔ اینگلو انڈین صحافت مسلمانوں کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی تجاویز انگریزوں کے زیر غور تھیں۔ انھیں عیسائی بنانا، جلا وطن کرکے افریقہ بھیج دینا اور قرآن کریم کی طباعت کو بھی ممنوع قرار دیے جانے کی باتیں چل رہی تھیں۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کہ سرسید احمد خاں سامنے آئے۔ انھوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو مغربی علوم اور انگریزی تعلیم سے آشنا ہونے کا مشورہ دیا۔ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر بغاوت کی۔ وجوہ بیان کیں اور جس طرح مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جارہا تھا اسے غلط قرار دیا اور سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اسباب بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ بغاوت کی ذمے داری حالات پر تھی۔ انھوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم کی اور اپنے تبادلے کے ساتھ اسے علی گڑھ لے گئے۔ انھوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' بھی نکالا۔ ان کا اخبار ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' ایک آزاد اخبار تھا جس کے اداریے سرسید احمد خاں خود لکھتے تھے اور سوسائٹی کے مقاصد بیان کرتے تھے۔ یہ اخبار ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ سرسید کا خیال تھا کہ موجودہ حالات کا مقابلہ صرف علم حاصل کرکے ہی کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے اداریوں میں انگریز حاکموں کے ظلم، صحافت کے وقار، مذہب، عوام کی جائز مانگوں اور معاشی مسائل کا بلا جھجک ذکر کیا۔ سرسید نے دیسی صحافت کے وقار کی حفاظت کی اور انگریزی اخباروں کی اردو اخباروں پر نکتہ چینی کا منہ توڑ جواب دیا۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کے حامی تھے۔ سرسید نے انگلستان سے واپسی پر 1870 میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ یہ رسالہ مہینے میں ایک بار یا دو بار یا کبھی تین بار چھپ جاتا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے غلط رسم و رواج اور خیالات کو بدلنا تھا۔ ''تہذیب الاخلاق کی چھٹی اشاعت میں انھوں نے اپنا لائحہ عمل پیش کیا تھا۔

حکیم محمود خاں نے منشی بہاری لال مشتاق کی ادارت میں دہلی سے ''اکمل الاخبار'' جاری کیا۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار گاہے بہ گاہے حکومت برطانیہ کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتا تھا۔ انکم ٹیکس لگائے جانے پر اس نے ''ہندوستان کی کمائی انگلستان نے کھائی'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ 1859 میں مدراس سے ''شمس الاخبار'' نکلنا شروع ہوا۔ یہ پندرہ روزہ اخبار بعد میں ہفتہ وار ہوگیا اور لگ بھگ نصف صدی تک نکلتا رہا۔ اخبار میں عربی، ترکی اور فارسی سے ترجمہ کرکے بھی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی بین الاقوامی شہرت تھی اس لیے مولوی عبدالحق نے اس اخبار کو ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار کہا تھا۔ ''اخبار عام'' 1871 میں پنڈت مکندرام نے نکالا جو پہلے'' ہمائے پنجاب'' کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ اس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں اور ان کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس میں بدلتے ہوئے حالات اور ترقی کرتی ہوئی دنیا کی جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔ اس اخبار کو اکھڑی ہوئی زبان پر لوگوں نے تنقید بھی کی ہے۔

اردو صحافت کے ابتدائی دور پر غائرانہ نظر ڈالنے کے بعد کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اردو صحافت خوف و ہراس کے ماحول میں پروان چڑھی۔ آغاز ہی میں کئی معیاری اردو اخبار جاری ہوئے جن میں دہلی اردو اخبار، اودھ پنچ، اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخبار خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ اخباروں میں قومی اور بین الاقوامی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ بیباکی اور غیر جانب داری بعض اخباروں کی خصوصیت تھی جس پر انگریزی حکومت سے انھیں سزائیں بھی ملیں۔ اردو اخباروں نے نہ صرف اردو زبان کے لسانی معیار کو سنوارا اور نکھارا بلکہ علمی و ادبی مضامین کے ذریعے قارئین کے ذوق کو بھی بلند کیا۔ اردو صحافت شروع ہی سے بامقصد تھی۔ اس نے سماجی اور اخلاقی معیار متعین کیے۔ سماج کو بیجا رسم و رواج سے نجات حاصل کرنے کی تلقین کی اور 1857 کے بعد انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی سعی مسلسل کی۔ مغرب میں سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب کو اردو صحافت نے متعارف کرایا، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے قارئین کو ذہنی آسودگی پہنچائی۔ اردو صحافت کے ابتدائی دور کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس سے اردو نثر میں متعدد اصناف متعارف ہوئیں جیسے مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، افسانہ نگاری وغیرہ۔ اس لیے لسانی وسعت اور نئی اصناف کو روشناس کرانے میں اردو کے ابتدائی دور کی صحافت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

□□□

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

آئندہ شمارے میں قرۃ العین حیدر اور گیان چند جین پر خصوصی گوشہ شامل ہوگا

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زرسالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

کاشف غزالی

حکیم عبدالحمید کی لسانی فکر

حکیم عبدالحمید صاحب بڑی متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے طب یونانی، تعلیم، اسلامیات اور لسانیات کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہوں۔ 14 سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو کر حکیم صاحب نے جس طرح گھر اور کاروبار کو سنبھالتے ہوئے اپنے نجی سرمایے سے یکے بعد دیگرے ادارے قائم کر کے ملک و قوم کی خدمت کی اس کی کوئی اہم مثال مشکل سے ملے گی۔

حکیم صاحب نے باضابطہ طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن بنیادی طور پر وہ ایک مفکر تھے۔ ان کا مزاج سائنسی تھا۔ ان کی فکر اور مزاج کی جھلک ان کے قائم کردہ تمام اداروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ایک مثال غالب اکیڈمی بھی ہے۔ ''غالب اکیڈمی'' کا افتتاح اگرچہ 22 فروری 1969 کو ہوا لیکن حکیم صاحب اس کے قیام کا فیصلہ 34 برس پہلے کر چکے تھے۔ اس زمانے سے غالب پر حکیم صاحب کو جو کچھ ملتا رہا وہ جمع کرتے رہے اور 1969 میں غالب اکیڈمی بننے پر لائبریری اور میوزیم کا قیام آسانی سے ہو گیا۔ 1968 میں غالب اکیڈمی کا میمورنڈم آف اسوسی ایشن تیار ہوا تو حکیم صاحب تمام امور پر تن تنہا کام کر چکے تھے۔ غالب کے تعلق سے انھوں نے دو سو عنوانات قائم کر کے تحریری مواد یکجا کیا تھا۔ ان سب کا حکیم صاحب نے بہ غور مطالعہ بھی کیا تھا۔ ان کی جمع کی ہوئی چیزوں میں خاص خاص جگہوں پر نشان لگے ہوئے ہیں۔

کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر حکیم صاحب سب کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ جملے چھوٹے اور مختصر ہوتے تھے لیکن ان پر گھنٹوں گفتگو ہو سکتی تھی۔ حکیم صاحب اخبار کا مطالعہ کرتے تو قلم ان کے ہاتھ میں ہوتا، ریڈیو پر خبریں سنتے تو قلم ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ ان کے اخباروں کے تراشوں اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں سے ان کی لسانی فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جن اخباروں کا حکیم صاحب مطالعہ کرتے ان کے تراشے درج ذیل عنوانات کے تحت جمع کرواتے تھے۔

(1) اردو سے متعلق انگریزی میں: انگریزی اخباروں میں اردو سے متعلق جو کچھ لکھا جاتا اسے حکیم صاحب اس فائل میں جمع کرواتے۔

(2) اردو سے متعلق اردو میں: اس فائل میں اردو اخباروں میں اردو زبان سے متعلق جو کچھ شائع ہوتا اس کے تراشے رکھواتے تھے۔

(3) انگریزی سے متعلق انگریزی میں: اس فائل میں انگریزی زبان سے متعلق انگریزی اخبارات میں جو کچھ لکھا جاتا اس کے تراشے جمع کیے جاتے تھے۔

(4) اردو ادب: اس فائل میں اردو ادب سے متعلق جو کچھ شائع ہوتا اس کی کٹنگ رکھی جاتی۔

(5) اردو اداروں سے متعلق: اس فائل کے تحت اردو اداروں کے بارے میں جو شائع ہوتا اس کے تراشے جمع کیے جاتے۔

(6) تراجم: تراجم کے تحت اردو میں دوسری زبانوں کے ترجمے رکھے جاتے اور اگر اردو کا کچھ کسی دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتا تو اس کو بھی رکھا جاتا۔

(7) ہندو مذہبیات: ہندو مذہب کے بارے میں اردو میں جو چھپتا اسے اس فائل میں رکھا جاتا۔

(8) ہندوستانی زبانوں سے متعلق: اردو میں اگر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بارے میں کچھ شائع ہوتا تو اس کو بھی فائل کیا جاتا۔

(9) رابطے کی زبان: رابطے کی زبان سے متعلق اگر کچھ شائع ہوتا تو اسے الگ فائل کیا جاتا۔

(10) لسانی پالیسی اور لسانیات: سرکار کی لسانی پالیسی سے متعلق جو چیزیں شائع ہوتیں اسے الگ فائل کیا جاتا۔

(11) کمپیوٹر: کمپیوٹر جب آج کی طرح عام نہیں ہوا تھا، اس سے متعلق جو کچھ شائع ہوتا اس فائل کے تحت رکھا جاتا۔

(12) مسلمانوں کے مسائل: اقلیتوں اور خاص طور سے مسلمانوں کے مسائل پر تراشے الگ فائل کراتے تھے۔

(13) تہذیب و تمدن: تہذیب و تمدن کے تحت تہذیبی سرگرمیوں کے بارے میں تراشے یکجا کیے جاتے۔

(14) انگریزی سے متعلق اردو میں: انگریزی زبان سے متعلق اردو میں شائع ہونے والی چیزیں اس فائل کے تحت رکھی جاتیں۔

(15) موسیقی، غزل گائیکی: موسیقی اور غزل گائیکی وغیرہ کے لیے الگ فائل بنائی گئی تھی۔

(16) ادبی اجتماعات: اس کے تحت ادبی جلسوں، مشاعروں اور سیمیناروں کی روداد یکجا کرنے کا بندوبست تھا۔

(17) عربی اور فارسی سے متعلق جو خبریں شائع ہوتیں اسے الگ فائل کیا جاتا۔

(18) رسم الخط سے متعلق: اس کے تحت فارسی اور ناگری رسم الخط کے متعلق جو کچھ ملتا اسے فائل کیا جاتا۔

(19) غیر ممالک میں اردو: آج اردو پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ حکیم صاحب دوسرے ممالک میں اردو سے متعلق سرگرمیوں کی اطلاعات کو الگ سے فائل کرواتے تھے۔

(20) اردو یونیورسٹی: اردو یونیورسٹی کے مطالبے اور تجاویز پر جو کچھ ملتا، اس فائل میں جمع کیا جاتا۔

(21) یوپی میں انگریزی پر پابندی سے متعلق: نوے کی دہائی میں سرکاری طور پر یوپی میں انگریزی پر پابندی لگ گئی تھی اور وزیر اعلیٰ انگریزی کی فائلیں واپس کر دیتے تھے۔ اس سے متعلق انگریزی اور اردو اخباروں میں بہت کچھ شائع ہو رہا تھا حکیم صاحب سارے تراشے جمع کرواتے تھے۔

(22) اہم ادبی شخصیتوں سے متعلق: اہم ادبی شخصیات سے متعلق اخباری تراشے جمع کرنے کا الگ نظام تھا۔

(23) جنوبی ایشیا: اس فائل میں جنوبی ایشیا سے متعلق خاص طور سے زبان سے متعلق جو کچھ شائع ہوتا اسے رکھا جاتا۔

(24) غیر ملکی زبانوں سے متعلق: انگریزی، عربی، فارسی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانوں کے بارے میں جو کچھ شائع ہوتا اس کی کٹنگ اس فائل میں رکھی جاتی۔

(25) اقبالیات: اقبال پر جو شائع ہوتا اسے الگ رکھا جاتا۔

(26) ہندوستانی زبان: گاندھی جی جس زبان کی حمایت کرتے تھے وہ ہندوستانی تھی، اس سے متعلق جو کچھ شائع ہوتا اس فائل میں رکھا جاتا۔

(27) لوک ادب یا عوامی ادب: اس سے متعلق تراشوں کی ایک الگ فائل بنائی گئی تھی۔

(28) آسان نظمیں اور غزلیں: اس کے تحت اردو میں جو آسان نظمیں اور غزلیں اخباروں یا رسالوں میں شائع ہوتیں انھیں جمع کیا جاتا۔

ان عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب زبانوں کے بارے میں کتنے حساس تھے اور ان کی لسانی فکر میں کتنی گہرائی تھی۔ زبان کے سلسلے میں حکیم صاحب گاندھی جی کے ہمنوا تھے اور ہندوستانی پر زور دیتے تھے۔ سارک ممالک کی تنظیم کی جب تشکیل ہوئی تو حکیم صاحب کو لگا کہ اس کے لیے ایک ایسی زبان کی بھی ضرورت ہوگی جسے سب لوگ سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ وہ زبان اردو بھی ہوسکتی ہے اور ہندی بھی۔ حکیم صاحب کا خیال تھا کہ اس پر اتفاق نہیں ہوسکتا، اگر ہندوستانی کی بات آگے بڑھائی جائے تو اسے سب تسلیم کریں گے۔ اس کے لیے رسم الخط کی آزادی دینی ہوگی۔ اس کے لیے صرف رومن، ناگری اور فارسی رسم الخط ہی نہیں بلکہ سارک ممالک میں جو بھی رسم الخط رائج ہیں ان میں یہ زبان لکھی جاسکتی ہے۔ حکیم صاحب نے 1992 میں ہندوستانی پروجیکٹ کا آغاز کرتے ہوئے ہدایت دی:

(1) بنیادی ہندوستانی بول چال کے لفظوں کا شبد کوش اردو ناگری اور رومن میں تیار کیا جائے۔

(2) ملے جلے ہندوستانی ادب کی ایک انتھالوجی تینوں رسم الخط میں تیار کی جائے۔

(3) تینوں لکھاوٹوں میں ہندوستانی ادب کا اتہاس لکھا جائے۔

(4) انگریزی میں شامل ہندوستانی لفظوں کی ایک ڈکشنری بنائی جائے۔

(5) اس طرح سارک ملکوں کی زبانوں اور ہندوستانی کے درمیان ایک سے لفظوں کی ڈکشنری بنائی جائے۔

(6) ہندوستان اور پاکستان میں بولی جانے والی علاقائی بولیوں میں ہندوستانی زبان کے لفظوں اور ہندوستانی میں ان بولیوں کے شبدوں کو اکٹھا کیا جائے۔

حکیم صاحب بی بی سی ہندی کی خبریں پابندی کے ساتھ سنتے تھے اور اس میں استعمال عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی فہرست بنا لیتے تھے لیکن جب وہ ہندوستان کی خبروں کا ذکر کرتے تو فرماتے تھے کہ یہاں زبان کو پتہ نہیں کیوں مشکل بنایا جا رہا ہے، چاہے اردو ہو یا ہندی۔ ان کی ایک تحریر پیش ہے جس میں زبان کو سادہ اور عام فہم بنانے کی بات کہی گئی ہے:

''بی بی سی کے اردو بلیٹن 4 اکتوبر 1997 کے چند مشکل الفاظ جن کے مفہوم سادہ اور زیادہ عام فہم الفاظ میں ادا کر کے اردو کو اور عوامی بنانے کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ ہندی بلیٹن کے الفاظ جیسا کہ میں مدتوں سے نوٹ کر رہا ہوں، زیادہ سادہ اور عوامی ہوتے جا رہے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی بلیٹن میں کام کرنے والوں میں مسلمان بھی ہیں جیسے ریحان فضل اور سلمیٰ زیدی وغیرہ لیکن اردو کے عملے میں شاید ایک بھی غیر مسلم نہیں ہے۔ ہندی اور اردو بلیٹن میں میل ملاپ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں کے ذمے داروں کے دفاتر نزدیک یا شاید ملے جلے ہیں جس کی وجہ سے وہ آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں لیکن افسوس کہ اس ملت جلت کا زیادہ فائدہ ہندی والے اٹھا رہے ہیں اور ہندی کو مقبول بناتے چلے جا رہے ہیں لیکن اردو والے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اپنا علم و فضل جتانے میں لگے ہوئے ہیں۔

کیا ان چند الفاظ کو سادہ زبان میں ادا نہیں کیا جاسکتا؟

متعدد افراد - کئی لوگ
زیر حراست - حراست میں، بندش میں
سامعین - سننے والے
جدید - نیا
بغور - غور سے
خدشہ - اندیشہ
افراد - لوگ
بعد ازاں - اس کے بعد
فوائد - فائدے
صاف گوئی - صاف صاف کہنا، لگی لپٹی کے بغیر
منقطع - الگ ہونا وغیرہ
قلت - کمی
علی الصبح - صبح ہی صبح، تڑکے
مصنوعی - بناوٹی
دستکشی - باز رہنا
تنازعہ - جھگڑا
مزید - اور
نبرد آزما - گتھم گتھا
گفت وشنید - بات چیت
واضح - صاف
ترک کرنا - چھوڑنا
ذخائر - ذخیرے
اضافہ - بڑھانا
ادویات - دوائیں
طویل عرصہ - لمبی مدت
قبل - پہلے
زیاں - نقصان
اثر انداز - اثر ڈالنے والا

وغیرہ وغیرہ

سماعت فرمایئے اور نظر نواز وغیرہ جیسی ترکیبوں پر تو مجھے واقعی غصہ آتا ہے۔ ہندی کے بہت سے الفاظ سننے اور بولنے میں زیادہ اچھے لگتے ہیں، جیسے پریم، پریمی، میل جول، سماج وغیرہ۔"

حکیم صاحب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والا دور آسان زبان کا ہی ہوگا۔ جب تک آسان زبان استعمال نہیں کی جائے گی لوگوں تک پہنچنا مشکل ہوگا۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، آج کے سٹلائٹ کے دور میں سبھی چینل اپنی زبان کو آسان بنا کر پیش کرنے میں سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔

❑❑❑

پتہ:
1071, Haveli Anwar Ali,
Bazaar Chitli Qabar, Near Suiwalan,
Jama Masjid, Delhi-110006

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئرپرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

تکنیک اور ترتیب وتقسیم کے اعتبار سے "جدید۔ ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے۔ جس میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی ومفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)

قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

راجیش مشرا

اردو درس و تدریس — چند تلخ حقائق

اردو زبان کے مسائل، اردو زبان و ادب کا مستقبل یا آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو تعلیم و تدریس کے مسائل وغیرہ کچھ ایسے عنوانات ہیں جن پر اردو کے تمام اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اس پُر آشوب دور میں ان مسائل کے حل کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے اور ان نامساعد حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، اس پر کسی قابلِ قدر نتیجے پر نہیں پہنچاتے۔ محبانِ اردو سیمیناروں اور مذاکرات میں اردو کی بقا اور ترقی کی تجاویز ہمیشہ پیش کرتے رہتے ہیں مگر ان میں زیادہ تر کا تعلق ادب سے ہوتا ہے نہ کہ زبان سے۔ ادب کی ترقی اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ زبان کی ترویج واشاعت بہتر طور پر کی جائے۔

آزادی کے بعد ہی سے ہندوستان میں تہذیبی انتشار کے دور کا آغاز ہوا۔ ہمارے تمام تر تہذیبی ادارے جن سے ہمیں زبان و ادب کا شعور حاصل ہوتا تھا، ایک ایک کر کے زوال پذیر ہوتے گئے۔ اکتسابِ زبان میں جو کردار تعلیمی اداروں کا ہوتا تھا، اس سے کہیں زیادہ ہمارے گرد و پیش کے ماحول اور معاشرے کا ہوتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے محلے کے بڑے بزرگ برائے ثواب یا وقت گزاری کے طور پر ہی سہی اپنے پاس پڑوس کے بچوں کے لیے مکتب جمایا کرتے تھے اور بلا تفریقِ مذہب و ملت زبان کی تعلیم اور باریکیاں سکھایا کرتے تھے۔ ابتدا ہی سے بچوں کے شین قاف پر توجہ دی جاتی تھی اور غیر شعوری طور پر بچہ انھیں اخذ کر لیا کرتا تھا لیکن گذشتہ دو تین دہائیوں سے مادیت اور مصروفیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سبب یہ سلسلہ بھی تقریباً منقطع ہو چکا ہے۔

اردو درس و تدریس کے سلسلے میں ایک اہم سوال اردو رسم خط کے تحفظ کا بھی ہے۔ اردو رسم خط کو ترک کر کے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کی جو مہم غیر اردو داں اور بعض اردو داں حضرات کی طرف سے چلائی گئی۔ اس سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور بقا کے لیے دیوناگری کو اختیار کرنے کے جو مشورے دیے جا رہے ہیں، ان کی آخری منزل اردو کی انفرادیت ختم کر دینے کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟ جب زبان کا اپنا کوئی رسم خط نہیں رہے گا تب شاید اردو کا اپنا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔ اردو زبان اور رسم خط سے متعلق پروفیسر گیان چند جین مرحوم کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"مانتا ہوں کہ رسم خط کا زبان کے ساتھ کوئی ازلی اور ابدی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی محدود ضرورت کی تکمیل کے لیے کوئی بھی زبان کسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صدیوں کی رفاقت اور چلن سے زبان اور رسم خط میں ایک نوع کی گہری اور اٹوٹ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صدیوں تک ادبیات کی تخلیق۔ ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت سے زبان اور رسم خط میں جسم اور جان کا سا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ جسم سے روح کا رشتہ ٹوٹتا ہے تو اپنے پرائے بھی اِنّا لله وَاِنّا الیه راجعُون پڑھ کر مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اس طرح زبان سے رسم خط کا رشتہ توڑ دیا جائے تو وہ کچھ دنوں تک شاید زندہ رہ جائے لیکن جہاں تک اس کے ادب کا تعلق ہے، وہ ضرور مر جائے گا۔" (1)

اس کا اندازہ اس امر سے بھی بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جو طالب علم اعلیٰ سطح کی تعلیم کے لیے یونیورسٹی اور کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں ان کی تحریری اور تقریری صلاحیتیں نیز تلفظ بھی اکثر خام ہوتا ہے۔ انھیں نہ تو اپنے تلفظ پر اعتماد ہوتا ہے نہ املا پر۔ کم و بیش یہی حال ان اداروں کا بھی ہے جو اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان اداروں میں داخلے کا معیار طلبہ کی قابلیت اور صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن ان اداروں میں داخلہ پانے والے طلبہ زبان اور رسم خط کی بنیادی معلومات سے بھی یکسر نابلد ہوتے ہیں۔ اردو زبان اور رسم خط سے بے اعتنائی کا عالم یہ ہے کہ یہ طالب علم اردو کے مصوتوں سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہندی اور انگریزی کے مصوتوں اور مصمتوں سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اردو میں حروفِ تہجی کی صحیح تعداد بیان کرنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ کسی بھی زبان کی تدریس کے جو معیار قائم کیے گئے ہیں ان میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ زبان کی تدریس کی ابتدائی سطح یعنی پرائمری کی منزل پر طلبہ زبان کی بنیادی مہارتوں پر دسترس حاصل کر لیں۔ جہاں ہندی، انگریزی اور دیگر زبان کے طلبہ ان بنیادی مہارتوں سے واقف ہوتے ہیں وہیں اردو کو بہ طور مضمون پڑھنے والے طلبہ اردو کے رموزِ اوقاف، اس کی مختلف علامتوں، ان کے ناموں اور محلِ استعمال سے بھی واقف نہیں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کے اس خیال سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

میں اس تعلق سے ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ میں نے جو کالج قائم کیے ہیں ان میں سے ایک یعنی خلافت کالج آف ایجوکیشن ممبئی کی مجلسِ انتظامیہ کے صدر کی حیثیت سے مجھے اتر پردیش سے آنے والے چند طلبہ کو انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ یہ سبھی افراد ڈگری یافتہ اور اعلی تعلیمی قابلیت کے حامل تھے لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ ہمارے کالج کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو ذریعۂ تدریس Urdu Methodology پر زور دیا جاتا ہے اور ٹریننگ کے دوران اردو میں ہی نمونے کے عملی سبق دینے پڑتے ہیں تو ان لوگوں نے اردو کے ذریعے پڑھانے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ شدید صدمہ پہنچا۔ (وفاقی ڈھانچہ اور لسانی اقلیتوں کا مستقبل۔ رفیق زکریا مضمون مطبوعۂ ہماری زبان 15 تا 22 جون 92)

اردو تعلیم و تدریس سے متعلق اس طرح کے انکشافات سے اب ہمیں کسی طرح کی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل جب تک ابتدائی سطح پر اردو زبان کی تدریس کا معقول بندوبست نہیں ہوگا اور اساتذۂ اردو بھی لگن اور محنت سے اپنے فرائض انجام نہیں دیں گے تب تک بنیاد کمزور ہونے پر بننے والی عمارت ناپائدار ہی ہوگی۔

اردو درس و تدریس کے سلسلے میں ہمارے دینی مدارس کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ اگرچہ کچھ خامیاں یہاں بھی ہیں لیکن ان مدارس میں زبان کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تدریس کے لیے بھی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے اور وہ پوری دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں۔ اگر اردو کی تعلیم و تدریس کا دارومدار سرکاری مدارس کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو سینہ کوبی کرنے کے سوا کچھ بھی نہ سوجھے۔ ان سرکاری مدارس میں داخلہ لینے والے طالب علم چوں کہ اکثر وبیشتر مسلم گھرانوں سے آتے ہیں اور اکتساب زبان کے لیے اردو اساتذہ کے محتاج نہیں ہوتے ہیں اس لیے اساتذۂ اردو کو اپنی ذمے داریوں سے چشم پوشی کرنے کے بھرپور مواقع حاصل ہوجاتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس کی صورتِ حال کا اندازہ ''جدید ہندوستان میں اردو تعلیم و تدریس: مسائل اور حل'' کے موضوع پر NCERT اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے تعاون سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار (7 تا 9 فروری 2000 دہلی) سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی رپورٹ سے چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

(1) پروفیسر نذیر ملک نے کشمیر میں اردو زبان کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو کشمیر میں سرکاری زبان ہے۔ وہاں اس کی انفرادی حیثیت ہے۔ وہاں کے شہر کے بچوں کے لیے اردو مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن کچھ مشکلیں یہاں بھی ہیں۔''

(2) لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر انیس اشفاق نے کہا کہ یوپی میں اردو تعلیم کی انتہائی افسوس ناک صورت ہے۔ ہماری زبان اپنے محاذ پر ہاری ہوئی جنگ لڑ رہی ہے۔''

(3) ''پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ مسائل تو یہ ہم جو یہ جو ہیں لیکن ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ کیوں نہ ایک تعلیمی کیشن بنایا جائے۔ اگر یہ کام حکومت نہیں کرسکتی ہے تو ہم کرسکتے ہیں۔''

(رپورٹ مطبوعہ ''ہماری زبان'' دہلی 15 مارچ 2000)

یہ صورتِ حال ان علاقوں میں ہے جنھیں ہم اردو زبان و ادب کا مرکز و گہوارہ کہتے ہیں۔ بقیہ علاقوں کی صورتِ حال یقینی طور پر ناگفتنی ہے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے یا مسائل کا حل تلاش کرنے کے بجائے نئے تعلیمی کمیشن اور مزید کمیٹیوں کی تشکیل کا مطالبہ اپنے کو خوابِ غفلت میں مبتلا کرنے سے زیادہ کیا ہوگا۔ وہ بھی ایسی صورت میں جب ہم گجرال کمیٹی اور علی سردار جعفری وغیرہ کمیٹیوں کی تجاویز اور سفارشات کا حشر دیکھ چکے ہیں۔ اردو درس و تدریس کی اس افسوس ناک صورتِ حال کی ذمے داری کس پر عائد کی جائے۔ اردو پڑھنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ پر، اردو سے حسد رکھنے والے اردو دشمنوں پر یا اردو کے بہی خواہوں اور اساتذہ پر۔

□□□

پتہ:
Regional Institute of Education
(NCERT) Ajmer (Raj)-305004

تنقیدی اور تہذیبی مطالعے

مصنف: طاہرہ پروین

اس کتاب میں اردو شعر و ادب اور خصوصاً نظیر، انیس، اقبال اور رشید جہاں کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں مذہبی و تہذیبی امور پر پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں مصنفہ نے مذکورہ قلم کاروں کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے لفظیات کی تدریس اور عملی تنقید کا بھی سہارا لیا ہے۔

صفحات: 191، قیمت: -/93 روپے

ممتاز عالم مصباحی

نیپال میں اردو

پوری دنیا میں اپنی بلندی کے لیے مشہور و معروف پہاڑ ہمالیہ کے دامن میں واقع سرسبز و شاداب ملک نیپال ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ اس کا رقبہ 147,181 اسکوائر کلومیٹر اور آبادی تقریباً تین کروڑ ہے۔ اس ملک کا سرکاری مذہب ہندومت ہے، جس کے ماننے والے ملک کی کل آبادی کا 90 فیصد ہیں۔ دوسرا بڑا مذہب بدھ مت ہے، جس کے ماننے والے آٹھ فیصد ہیں۔ ان دونوں مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر تال میل رکھتے ہیں کہ دونوں کے مسلک اور مظاہر میں فرق و امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف آپ ہندو مندروں میں گوتم بدھ کی مورتی دیکھیں گے وہیں دوسری جانب بدھ عبادت گاہوں میں بھی آپ کسی نہ کسی ہندو دیوی دیوتا کی مورتی ضرور پائیں گے۔ زیادہ تر مندر پگوڈا طرز کے ملیں گے۔ قدیم محلوں کے نقش و نگار بھی تصویروں کی صورت میں اجاگر نظر آتے ہیں۔ نیپال کا ہر مذہبی و تمدنی گروہ دوسروں کی تہذیب و ثقافت اور مذہب کا احترام کرتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں عام لوگوں کے لباس اور رہائش وغیرہ میں مغربی تہذیب کے اثرات ضرور دکھائی دیتے ہیں تاہم عمومی طور پر آج بھی نیپال کے عوام اپنی قدیم مذہبی، تمدنی اور سماجی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

نیپال کی آبادی چونکہ چھوٹے چھوٹے نسلی گروہوں پر مشتمل ہے اس لیے ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک نیپال کی سرکاری زبان نیواری تھی جو نیپالی عوام کی بول چال کی زبان تھی لیکن اٹھارھویں صدی کے نصف سے لے کر آج تک سرکاری زبان کی حیثیت نیپالی کو حاصل ہے۔ اس کا ماخذ سنسکرت ہے اور اسے دیوناگری اسکرپٹ میں لکھا جاتا ہے۔ دوسری اہم زبانیں ہندی، میتھلی، اردو، بھوجپوری، اودھی، تمنگ اور نیواری وغیرہ ہیں۔

اردو نیپال کی قدیم زبانوں میں سے ہے لیکن اس کے فروغ کے لیے کوئی قابل ذکر کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ اگر اردو نیپال میں بولی جاتی رہی تو اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ بہار، یوپی اور دوسرے سرحدی صوبوں کے مسلمان وہاں بودوباش اختیار کرتے رہے، جنھوں نے مدارس قائم کیے۔ جن میں اردو زبان ہی ذریعہ تعلیم رہی۔ اردو کے رواج پانے کی دوسری بڑی وجہ یہ رہی کہ جس دور میں نیپالی زبان نشوونما کے مراحل میں تھی اس وقت ہندوستان میں اردو عروج پر تھی اور سرکاری و عوامی سطح پر چونکہ نیپال کا ہندوستان سے بہت ہی گہرا ربط و تعلق رہا ہے اس لیے غیر ارادی طور پر نیپالی زبان نے اردو کے اثرات کو خوب قبول کیا، بیشتر الفاظ تلفظ کے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ نیپالی زبان کا مستقل حصہ بن گئے۔ نیپال کی عدالتی زبان تا حال فارسی آمیز اردو ہے۔

نیپالی زبان میں اردو الفاظ کس حد تک دخیل ہیں اس کا کچھ اندازہ ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔ حضور، سرکار، موصوف، ثبوت، ساتھ، بموجب، مالک، صدمہ، جال، فرار، جنگ، شروع، پیش، افسوس، تیار، خطرہ، ساج، فوجداری، کاغذات، گرفتار، ہفتہ، کاروبار، خاص، قانونی، ضلع، خریداری، نکاس، سلسلہ، آخر، شروع، تعلیم، کمزوری، زندگی، فرصت، رقم، بندوبست، دربار، اچانک، جامہ، پگڑی، لبادہ، نیلام، زبان، لاپروائی، منافع، سکّہ، صفائی، اطمینان، بے روزگاری، ناکہ بندی، مرمت، قدم، خانہ تلاشی، ضبط، جواب اور غلط وغیرہ۔

نیپال میں اردو زبان کے رواج میں نمایاں تیزی اس وقت بھی آئی جب لکھنؤ کے مشہور و معروف نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں سے شکست کھا کر اپنے چند قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ کاٹھمانڈو میں آکر پناہ گزیں ہوئیں۔

1950 تک اردو زبان کے اثرات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اردو میں شاعری بھی کی جانے لگی تھی، اگر چہ رسم الخط نیپالی تھا اور اوزان اور ردیف قافیے بھی درست نہیں تھے۔ نمونے کے طور پر راناؤں کے خلاف جدوجہد کرنے والے ایک شاعر کھڑک مان سنگھ کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

پیا جھوم جھوم کر جو جام محبت
حب وطن کا دوانہ بنا میں
ستارو! چمک کر ہنسو تم نہ مجھ پر
اندھیرو! پلٹ کر دکھا نہ مجھے ڈر
مشرق میں دیکھو پیام زمانہ
چلا آرہا ہے شعلے کو لے کر
مصیبت کا مجھ پر اثر ہی نہیں ہے
کبھی غم بھی آنکھوں میں رکتا نہیں ہے

نیپال میں اردو کے فروغ کی کوششوں کا باضابطہ آغاز اس وقت سے ہوا جب 1982 میں محمد ابوالفضل صاحب کاٹھمانڈو میں پاکستان کے سفیر بن کر گئے۔ موصوف چونکہ اردو زبان و ادب سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اس لیے

انھوں نے نیپال میں اردو کے اثرات کو دیکھ کر اس کے فروغ کے لیے باضابطہ کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو کو نیپال کے تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے لیے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں اور وزارتی سطح پر بھی راہ ہموار کی اور پاکستان کی وزارت تعلیم سے بھی مذاکرات کیے۔ دو ڈھائی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد انھیں کامیابی ملی اور تری بھون یونیورسٹی کاٹھمانڈو میں 1985 کے تعلیمی سال سے شعبۂ اردو کا آغاز ہو گیا جس کے لیے پروفیسر کے طور پر ڈاکٹر طاہرہ قمر کا انتخاب کیا گیا۔ سفیر موصوف نے ایک قابل ذکر کام یہ بھی کیا کہ اردو کی ابتدائی تدریس کے لیے انٹرنیشنل لینگویج کیمپس میں ایک چار ماہ کا مختصر کورس شروع کرایا، جس کا مقصد اردو لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ اردو زبان و ادب کو مزید فروغ دینے کے لیے انھی دنوں پاکستانی سفارت خانے کی سرپرستی میں شعبۂ اردو اور متعدد نیپالی شعرا و ادبا کے اشتراک و تعاون سے ''انجمن اردو و نیپالی زبان و ادب'' کا قیام بھی عمل میں آیا، جس کا مقصد دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور دونوں ممالک کے عوام کے درمیان شعر و ادب کے ذریعے گہرا ربط و تعلق پیدا کرنا تھا۔ نیپال کے مشہور و معروف شاعر و ادیب مسٹر دیوندر راج اُپادھیائے نے فیض احمد فیض کے منتخب کلام کا نیپالی زبان میں ترجمہ کیا جو نیپال کے علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا، اس کے علاوہ ڈاکٹر طاہرہ قمر کی کتاب ''نیپال میں اردو'' اور قمر ندیم کے سفرنامے ''وادیِ حیرت'' کا بھی نیپالی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

تری بھون یونیورسٹی کاٹھمانڈو میں اردو شعبے کے علاوہ آج ملک کے بیشتر کالجوں اور اسکولوں میں اردو زبان اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستان کی طرح نیپال میں بھی جگہ جگہ مدارس اور مکاتب قائم کیے گئے ہیں جن میں اردو کی ابتدائی تعلیم بچے ضرور حاصل کرتے ہیں۔ ملک کے چند بڑے مدارس اور دوسری غیر سرکاری تنظیمیں اردو زبان میں سالانہ، سہ ماہی، ماہانہ اور پندرہ روزہ رسائل اور اخبارات بھی نکالتے ہیں۔ کسی روزنامے کی کمی کا شدت کے ساتھ احساس کیا جا رہا ہے۔ ملک کا علمی و ادبی اور سرمایہ دار طبقہ اس کے لیے مشترکہ کوشش کرے تو یہ کمی بھی پوری ہو سکتی ہے۔

□□□

پتہ:
Arabic Languages Literary Teacher,
Jamia, Amjadia Rizwia,
Ghosi, Distt. MOU, (U.P.)

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک

مترجم: مسعودالحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 652، قیمت: -/111 روپے

قرۃ العین حیدر

کچھ اپنے بارے میں

...رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین و حضرات پر آتا ہے۔ ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز دوسرے وہ لوگ جو آکسفورڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانہ جو موڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی تھا تو میں نے یقیناً بھرت ناٹیم میں مہارت حاصل کی ہوتی...اور اگر مجھ میں Drift کرنے کی عادت اور سُستی نہ ہوتی تو میں یقیناً آکسفورڈ یا کیمبرج میں مستقل قیام کرتی...

ہنکر لائن کا ایس ایس سائیلشیا، انگلستان سے واپس آرہا تھا۔ ایک شام مغرب کے وقت میں عرشے پر ریلنگ سے لگی بحیرۂ روم کی لہروں کو ملاحظہ کررہی تھی۔ جب امی نماز پڑھ کر اپنے اسٹیٹ روم سے برآمد ہوئیں اور قریب آکر بیٹھ گئیں اور چند منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا "اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تم کو عقل دے۔"

سارے بہی خواہ میرے لیے ہمیشہ سے یہی دعا مانگتے آئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آج تک نہ سنا۔ اس نے سب کچھ دیا الا دنیاوی اور مالی معاملات کی سوجھ بوجھ، ہوشیاری اور کومن سنس کے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیاداری کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ جیرالڈ، میلے، ہوکنز یا دیبر یا انیس سے ناواقف ہیں۔

مثال کے طور پر آپ بیتی لکھنے کا معاملہ۔ آتم کتھا ظاہر ہے اپنی پیدائش سے شروع کی جاتی ہے اور چند سطور یا پیرگراف یا صفحات خاندان کے متعلق۔ میں نے اس کے لیے تیرہ سو سال کھنگالے اور اس سے بھی قبل ابراہیم اور باب اجتہاد تک۔ کیونکہ مجھے تاریخ سے ازحد دلچسپی ہے اور میں اپنے عرب، عبرانی، ایرانی، تورانی اور ہندوستانی ورثے کو آپ بیتی میں شامل اور اس کا ایک لازم حصہ سمجھتی ہوں۔ نیگرو مصنف کی کتاب Roots نے ان دنوں مغرب میں دھوم مچا رکھی ہے۔ ناچیز نے "کارِ جہاں دراز ہے" (جلد اول) اس سے بہت پہلے لکھنا شروع کی تھی۔ بلکہ اس سے بھی قبل جب والد کا انتقال ہوا اس کے تیسرے چوتھے دن بیٹھ کر میں نے بچپن کی کہانی لکھنی شروع کی کیونکہ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوگیا تھا کہ یہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔ اسے ریکارڈ کرلینا ضروری ہے (وہ کہانی تلف ہوچکی ہے) والدہ کو بھی آپ بیتی لکھنے کا عارضہ لاحق تھا۔ انھوں نے 1908 سے روزنامچہ لکھا جو برسوں "تہذیبِ نسواں" اور "عصمت" میں چھپا کیا۔ پھوپھی زاد بہن فاطمہ خاتون مستقل کنبے کی اور اپنی زندگی کے متعلق "عصمت" میں لکھا کرتی تھیں۔ چچی وحیدہ (بیگم نصیرالدین حیدر) اپنی شادی سے قبل 1911 کے نہٹور میں اپنا روزنامچہ لکھتی تھیں جو "عصمت" میں چھپتا تھا۔ ثابت یہ ہوا کہ انسان کی بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق سوچتا ہے کہ ان کو قلم بند کرنا ضروری ہے۔ شعر کی صورت میں بطور جگ بیتی یا آپ بیتی یا بطور ذاتی فلسفہ۔ شاید 1955 میں اسداللہ شاہ بخاری نے نیویارک سے مجھے خط لکھا کہ میں ادیبوں کے اپنے فلسفۂ حیات پر ایک کتاب مرتب کررہا ہوں "زندگی نے مجھے کیا سکھایا" وغیرہ۔ تم بھی اپنا فلسفۂ زندگی بھیجو۔ میں نے جواب دیا "بخاری صاحب آنسوؤں کی وادی میں ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ کوئی باضابطہ فلسفۂ حیات مرتب کرسکوں یا فیصلے صادر کروں۔ ممکن ہے آج سے پندرہ بیس سال بعد کچھ بات بنے۔" تو آج 1978 میں بھی معلوم ہوا کہ کوئی ذاتی فلسفہ مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ سب گھپلا ہے۔

"نقوش" نے شاید 57 میں شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ اس کے لیے محمد طفیل نے کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) سے ناچیز پر مضمون لکھوایا۔ اس مضمون پر میں نے فٹ نوٹ کا اضافہ کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں—

"ہم بہت ذوق و شوق سے رسالہ "شمع" بھی پڑھتے ہیں جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہوکر ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے۔ ایک کمرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں چوہے دوڑ لپی آئی کھیلا جارہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہورہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائٹ لفٹنٹ۔ مگر ان کا یہ عالم ہے دنیا بھر کی فضولیات و خرافات سے انھیں سخت دلچسپی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز ہم لوگ گھاس پر بیٹھے نہایت اطمینان سے شکرا کو کدارا میں خلل کرنے میں مصروف تھے جب ایک بھائی نے اچانک یہ انکشاف کیا کہ ایک چیز اور ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی

''خصوصیات'' بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں اور اسی لیے وہ دوسرے لمبے گھاس پر سے اٹھ کر کنیڈا چلا گیا۔''

''اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس فٹ نوٹ کا اضافہ کرنے سے قبل یہ بھی عرض کر دوں کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارا جو معاشرہ ہے جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے Complex میں گھرا ہوا ہے۔ میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔ رہی ہماری شخصیت تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم کیا اور ہماری شخصیت کیا— یہ کیا مسخرہ پن ہے۔''

یہ آخری حملہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس وقت ن م راشد نے زندگی کے متعلق میرے رویے کو School-Girlish کہا تھا تو سنس آف ہیومر کے ساتھ چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی بدولت School Marmish اپروچ تو میری آج تک نہ بن سکی۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا (ڈاکٹر جانسن کے ساری عمر نثر بولتے رہنے کی طرح) کہ لکھنے میں اتنی Blaa, Blaa اور عملی زندگی میں اکثر نہایت بیوقوف۔ دراصل میری ساری اپروچ ہر معاملے میں ذہنی اور جذباتی یعنی Emotional (Sentimental ہر گز نہیں) پریکٹیکل بہت کم اور ہر چیز اور انسان حیرت انگیز ہیں اور دنیا کی ساری کہانی اور اس کا پھیلاؤ اور اس کا اختصار یعنی فنا اور اس کی بقا تو کیا آپ بیتی شروع کرنے کے لیے میں کوہ ارارات کیوں نہ جاؤں؟

لہٰذا میں اچھی چیزوں سے بے حد محظوظ ہوتی ہوں۔ ذرا سی خوشی بے انتہا Elation اور ذرا سی فکر اور پریشانی بے حد ڈپریس کرتی ہے اور میں Humbug اور منافقت کو کبھی برداشت نہ کر پائی اور میں نے ملکوں ملکوں گھوم کر بہترین کتابیں جمع کیں اور ملکوں ملکوں انواع و اقسام کے کام کیے جن کا تعلق Media اور لکھنے سے تھا۔ کراچی اور لندن میں سرکاری افسر اور جرنلسٹ رہی اور دستاویزی فلم بھی بنائے۔ یہ سب احوال ''کار جہاں دراز ہے'' جلد دوم میں تفصیل سے رقم کیا۔ یہاں مختصراً دہرانا بوریت ہے۔

انگریزی میں اخباروں میں لکھنا کالج چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد سے شروع کیا۔ یہ فرمائش فیض صاحب سب سے پہلے ''پاکستان ٹائمز'' میں جارج برنارڈ شا کے انتقال پر اس استاد بزرگ کے متعلق مضمون لکھا۔ پروفیسر وقار عظیم نے اسے فوراً اردو میں ترجمہ کر کے شاید نقوش میں شائع کیا۔ اس کے بعد مزید مضامین اور نظمیں پاکستان ٹائمز میں، ڈیلی ٹیلی گراف لندن، ایسٹرن ورلڈ لندن، پاکستان کوارٹرلی کی یک سالہ ادارت۔ پھر یہاں ممبئی میں تین سال امپرنٹ کی منیجنگ اڈیٹر۔ پھر ایک سال یہ کہ از مدیران امپرنٹ (دوسرے دو مدیر نسیم ازیکل اور کورل چنرجی مرحومہ) 1968 میں اس رسالے کو گوا کے ایک تیز طرار کاروباری نے خرید لیا جن کا نام آر ایس پنڈت تھا۔ انھوں نے کہا ''اس کا اداریہ میں لکھا کروں گا۔'' میں نے کہا ''آپ سرمایہ دار ہیں۔ آپ نے یہ رسالہ خریدا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جرنلسٹ بھی ہیں۔ آپ اداریہ میں کیا لکھیں گے؟ تو پھر رسالہ بھی آپ ہی ایڈٹ کیجیے۔'' اور اسی وقت استعفیٰ دے کر گھر آ گئی۔ پھر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا آٹھ سال جس میں لکھے ہوئے ناچیز کے مضامین اور فلم ریویو مقبول خواص و عوام ہوئے۔ پھر وہ مشہور واقعہ سینٹرل بورڈ آف فلم سنسرز کا تفصیل جلد سوم میں ملاحظہ کیجیے گا کہ اب اس کے تذکرے سے کوفت اور شدید بوریت ہوتی ہے مگر اس کے سلسلے میں اور اس سے ذرا پہلے ان لوگوں نے زک دی جن کو میں نے بوجہ بیوقوفی اپنا دوست سمجھا تھا۔ خصوصاً جن صاحب کی سنسر بورڈ میں بحالی کے لیے دوران ایمرجنسی مارے شرافت کے میں نے دوڑ بھاگ اور کوشش کی تھی، خود فی الفور انھوں نے ہی مجھے شدید نقصان پہنچایا۔ تب مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ Male-Dominated سوسائٹی میں ایک خاتون کو خواہ اس کی کتنی ہی کوالی فیکیشنز اور ٹیلنٹ ہو اس طرح کی صورت حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو خیر پسماندہ مشرق ہے۔ مغرب میں ویمنز لب کی تحریک بلا وجہ وجود میں نہیں آ گئی (جہاں تک عورتوں کی ذہنی اور اقتصادی آزادی اور حقوق اور ہمسری اور خودداری کا تعلق ہے میں ویمنز لب کے ساتھ ہوں مگر اس تحریک کی اخلاقی بے راہ روی کی مخالف اور اس سلسلے میں ہمیشہ کی مولوی) یا آپ ذہن پرست حلقوں میں Pseud گیری کرتی پھریے بہت مقبولیت حاصل ہوگی اور کامیابی۔ پوچھیے یہ کون چیز ہے۔ عرض کرتی ہوں۔ السٹریٹیڈ ویکلی میں میری بے حد دلچسپ رفیق کار بچی کر کریا نے یہ اصطلاح ایجاد کی تھی۔ بروزن داداگیری یعنی Pseudo-Intellectual خواتین و حضرات کی Pseud گیری۔ ہم دونوں نے اس لائف اسٹائل اور مدرسہ فکر پر کافی ریسرچ کی اور یہ بھی طے کیا تھا کہ ایک نہایت سوڈ گیری سے لبریز مضمون لکھیں گے یا ایک دوسرے کا انٹرویو اور اسے ویکلی میں چھاپیں گے اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے بے حد سنجیدہ مضمون سمجھ کر پڑھیں گے کیونکہ یہ عام پر سوڈ گیری ہی کا دور ہے۔ یا آپ زندگی کے ہر شعبے میں ''سیکنڈ فڈل'' بنی رہیے۔ ورنہ آپ کو شعوری اور غیر شعوری طور پر Resent کیا جا سکتا ہے۔ ایسا اکثر ادب میں بھی ہوتا ہے۔

تو بسلسلہ آپ بیتی تاریخ وار یہ بتانا کہ اس سن میں یہ کیا اس سن میں یوں کدو میں تیر مارا۔ تو یہ سب ''کار جہاں.....'' کی Trilogy میں قلم بند کر لیا ہے

تا کہ سندر ہے۔

مسئلہ سنہ اور تاریخ کا نہیں۔ مسئلہ سارے اسرار کا ہے۔ پارٹ آف دی ہسٹری کہاں اور کیا اور کون؟ سرکٹ ہاؤس میں بونے کی ناکام کوشش کی اور امی مالی سے باتیں کرتی قریب سے گزر گئیں۔ ریت پر سے گزرتا ایک طویل سایہ اور دوپہر کے وقت تیز دھوپ برآمدے کے سامنے سفید دھوتی اور پوپلے منہ والی بوڑھی عورت آکر اُکڑوں بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی برتن تھا۔ اس نے کہا ''ہم نیا ماں آت رہن، نیا ڈوب گئی۔'' امّی نے اس کو پیسے دیے۔ چند روز بعد وہ پھر آئی۔ ''ہم نیا ماں آت رہن، نیا ڈوب گئی۔'' امّی نے اس کو پیسے دیے۔ چند روز بعد وہ پھر آئی۔ ''ہم نیا ماں آت رہن، نیا ڈوب گئی۔'' ''تم ہر دفع نیا ماں آت ہو، نیا ڈوب جات ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''ہاں تو پھر کا کری۔'' اس نے جواب دیا۔ دنیا کا یہی سارا ڈرامہ ہے جو بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ تو پھر کا کری۔ تو پھر کا کری۔

دریا کے کنارے اونچے سہ منزلہ مکان کے صحن میں اُوشا ناچ رہی تھی۔ چھن چھن چھن۔ اس کے جواں سال ماں باپ ہمارے والدین کے گہرے دوست تھے۔ ان کا نام شاید سیٹھ نرنجن داس تھا۔ ان میاں بیوی کی تصویر ہمارے ڈائننگ روم کے آتشدان پر رکھی رہتی تھی۔ بانکے والد کی نوکیلی مونچھیں۔ ڈریس سوٹ۔ والدہ بالکل سرت چندر کی ہیروئن۔ وہ کون لوگ تھے؟ اب ان کے متعلق بتانے والا بھی کوئی باقی نہیں۔ تاریخ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔

اور تالاب میں سرخ کنول اور اس کے گرداگرد ڈھنالی اور ہانسی کودتی پھر رہی ہیں اور رات کے وقت ان کے گھر کی چھت پر ایک کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور ان کا ایک نوکر ایک لکڑی کے ٹکڑے کو (شاید وہ ''جگن ناتھ جی'' تھے) لالٹین کے سامنے رکھ کر اسے بار بار پرنام کر رہا تھا۔ میں دروازے میں بھی متحیر کھڑی ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر سنجیدگی سے کہتا ہے۔ ''یہ ہمارے کھدا میاں ہیں۔''

جب سے اب تک لوگوں نے مجھ سے اپنے اپنے کھدا میاؤں کے متعلق اسی وثوق سے بات کی ہے اور ڈھنالی بڑی ہو کر اخبار میں پڑھا کہ ایک اطالوی فلم ڈائرکٹر کے ساتھ اٹلی چلی گئی اور روم میں ایک بوتیک چلاتی ہے۔ تعجب خیز، اور شکارگاہ میں رات ہم سب بچے، بھائی، میں، صہیب، سلویا، مظفر تھوڑی دیر کے لیے مچان پر لے جائے جاتے ہیں۔ مجھے بڑی سخت نیند آرہی ہے۔ دور سے ایک ٹرین گزرتی ہے۔ میں چلا کر کہتی ہوں۔ وہ دیکھیے جیسے جگنوؤں کی قطار۔ اُلن متاں لتاں سے کہتے ہیں لو باجی تمھاری لڑکی بھی بڑی ہو کر افسانہ نگار بنے گی۔ عمر چھ سال پہلی کہانی لکھی۔ ''کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹین لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔'' کہانی لکھ کر اسے خود ہی مصور بھی کرتی۔ بشیر خاں ڈرائیور قریب آکر کھڑے ہو جاتے۔ نہایت متانت سے تصویر کشی دیکھتے اور کہتے ''بی بی چھبّا کھینچ رہی ہیں۔''

کزن پیارے میاں کو ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوائی بندوق عطا کی جس کے بدلے میں انھوں نے مجھے اپنا کیمنوسیٹ اور چڑیوں کے رنگین پر پیش کیے۔ کزن اُچھو نے اپنا گڑیا کا ناشتہ دان عنایت کیا۔ میں نے ان کو اپنی سرخ پھولوں والی ہیٹ۔ کزن شاہجہاں بیگم بنت نواب محمود پور دہرہ دون آئیں۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر انھوں نے بٹوے میں سے ریزگاری نکالی۔ اسے احتیاط سے گنا اور نہایت متانت کے ساتھ کہا ''یہ بارہ آنے ہیں، میں اس کی ایک اچھی سی موٹر خریدنا چاہتی ہوں۔''

ساری عمر اس گمشدہ معصومیت کی تلاش۔ کوشک، قرولباغ، دہلی۔ جمیلہ، نسیمہ اور چتّی اور میں باغ کے گول چبوترے پر ''ثریا کی گڑیا'' ڈرامہ کر رہے ہیں۔ (یہ ڈرامہ شاید غلام عباس نے لکھا تھا اور بچوں کے اس نفیس ادب میں شامل تھا جو دارالاشاعت لاہور اور پھول اخبار نے تخلیق کیا) چتّی میری گڑیا لیڈی بلینڈا سنبھالے ہیروئن۔ پھر تینوں بہنیں کہتی ہیں تم نے یہ ڈانس دیکھا ہے؟ دیکھو وہ دونوں تالیاں بجا بجا کر گول گول چکر کاٹتی ہیں اور ایک سانس میں گاتی جاتی ہیں۔ مانجھی رے ہوڑی ہنکال مانڈ ہری مانڈ والے۔ پھر وہ مطلع کرتی ہیں۔ یہ گرباڈانس ہے۔ ہم نے اسکول میں سیکھا ہے۔ میں بہت مرعوب ہوتی ہوں۔ مانجھی رے ہوڑی ہنکال مانڈ ہری مانڈ والے۔ (اس کے اصل الفاظ اب جا کر چار پانچ روز قبل اتفاقیہ معلوم ہوئے۔ ماجھیرا ہوڑی ہنکار۔ مارے جاؤ جھے جمنا پار) چنانچہ اس طرح ہم ساری عمر غلط الفاظ یاد رکھتے ہیں۔ کوشک کے فوراً بعد نور منزل علی گڑھ۔ وہاں کزن زلیخا الائچی پھر رہی ہیں ''میرے بکھران چلی تیر نظر۔'' وہ مجھے بتاتی ہیں یہ خورشید آپا نے ہم لوگوں کو ڈانس سکھایا ہے۔ میں اور زیادہ متحیر اور مرعوب ہوتی ہوں۔ (خورشید آپا انہی دنوں نئی نئی رینوکا دیوی بنی تھیں)۔ یہ ''میرے بکھران'' کیا ہوتا تھا؟ یہ بچوں کی اپنی زبان تھی اور میں بھی بہت دنوں تک ''میرے بکھران'' الائچی پھری۔ اور سیلو چوکلیٹ میں سے نکلنے والی فلم اسٹارز کی تصاویر۔ میلٹن ایڈی، پولٹ گوڈارڈ، جینیٹ مک ڈانلڈ اور ان کے سیلو البم جو دہرہ دون میں توفیق رفعت اور میں بے حد انہماک سے تیار کرتے تھے اور ہمیشہ پر امید اور متوقع کہ جانے اس چوکلیٹ میں سے کس کی تصویر نکلے گی۔ کسی چیز کے اندر سے کیا چیز برآمد ہوگی۔ نہاں خانۂ اسرار۔ او دلربا کہاں تک ظلم و ستم سہیں گے۔ (یہ شاید پہاڑی سانیال کا گانا تھا)

اور حسنین ماموں اور اُلن ماموں، لڈن ماموں اپنی سریلی آواز میں گا رہے ہیں۔ وہ تینوں بھی معدوم ہو چکے۔ سُر نکلا اور غائب۔ محرم نہیں ہے کوئی نوا ہائے راز کا۔

اور پھولوں میں کیا ہے؟ سفید فرنگی پانی جو دہرہ دون میں مارچ اپریل

میں کھلتا تھا اور رات کی رانی اور گل جعفری، گل ہزارہ، گل مہتاب، گل مخمل، گیندا کی کائنات الگ ہے۔ اسی کو گل جعفری کہیے، اس سے منسوب کائنات مختلف ہو جائے گی۔

کالج کے فرسٹ ایئر میں پہنچنے تک گڑیاں الماری میں بجی تھیں۔ سب سے نیچے اصطبل، پھر شاگرد پیشہ، پھر باورچی خانہ، پھر ڈرائنگ اور ڈائننگ روم۔ سب سے اوپر بیڈروم۔ گڑیوں کا اسکول الگ قائم کیا تھا۔ لندن کی چھپی ننھی منی کتابیں پریوں کی۔ کہانیاں وہ گویا ان کی تعلیم کا کورس تھا۔ کسی نوع کی پرستانی کہانیوں میں یقین رکھتے ہیں اور کھلونوں سے بھی جی بہلاتے ہیں۔ یہ کتابیں گڑیوں کے کورس میں میں نے شامل کی تھیں۔ گڑیاں، کھلونا ٹرک میں بیٹھ کر اسکول جاتی تھیں۔ ایک کپڑے کی ہندوستانی گڑیا جو مجھے مرادآباد میں کسی نے بنا کے دی تھی۔ میں نے ان جرمن گڑیوں کی آیا مقرر کی تھی۔ یعنی ذہن میں لاشعوری طور پر یہ خیال جاگزیں تھا کہ یہ بیچاری کپڑے کی شکر پارے کی آنکھوں والی ان یورپین گڑیوں کی نوکرانی ہی ہو سکتی ہے۔ جرمنی میں چھپی پرستانی کہانیوں کی کتابیں بے حد خوبصورت تھیں۔

اٹاوے میں جب فقیرا خانساماں رات کو سلام کرنے آتا تو پابندی سے کہتا "سلام بیگم صاحب، سلام بابا، سلام بی بی، سب گڑیوں کو سلام!" کیونکہ میں نے اسے بتا رکھا تھا کہ گڑیوں کو گڈ نائٹ کہنا بھی ضروری ہے۔ وہ سب باتیں سمجھتی ہیں۔

"پھول" اور اس کے بعد "بنات" میں لکھنا شروع کیا۔ اگر وہ کہانیاں حاصل کر لی جائیں۔ مثلاً "چوکلیٹ کا قلعہ" جو "بنات" میں چھپی تھی تو اس کے ذرا ہی بعد جو افسانے "ساقی"، "ادب لطیف" اور "سویرا" وغیرہ میں شائع ہوئے۔ تو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی "چوکلیٹ کے قلعے" کی توسیع تھے۔

امی اور چچی وحیدہ تخت پر لیٹی باتوں میں مصروف تھیں۔ جیسے چائلڈ آرٹ ہوتا ہے۔ میں نے کاغذ پر دو دائرے بنا کر ان کے اندر دو نقطے لگائے گویا آنکھیں۔ ایک نقطہ پھسل کر لکیر کی صورت میں ایک دائرے سے باہر آگیا۔ میں نے کاغذ ان دونوں کو پیش کیا اور کہا "یہ لیجیے آپ دونوں کی تصویر۔" چچی جان نے مسکرا کر لکیر کے لیے پوچھا "اور یہ کیا ہے؟" میں نے فوراً جواب دیا "یہ آپ کا بندہ۔" اس وقت میری عمر چار سال کی تھی۔ وہ منظر اچھی طرح یاد ہے۔ تو واضح ہو کر نقطہ اگر پھسل کر لکیر بن جائے تو اس کی کچھ بھی عالمانہ تاویل کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے جیسے لکیر کو کہہ دیا بندہ!

اور اسی نقطہ سے میں "تلازمہ خیال" اور "شعور کی رو" پر آتی ہوں۔ جن مغربی اصطلاحات کا میری تحریروں کے سلسلے میں مستقل ذکر کیا جاتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ میری یادداشت فوٹوگرافک ہے (ہر افسانہ نگار کی ہوتی ہے ورنہ وہ کہانیاں نہ لکھے) اور اپنے تلازمہ خیال کی ایک توجیہ میں اس طرح کر سکتی ہوں کہ ایک دوہرے کلچرز پیٹرن میں پرورش پائی۔ میرے گھر پر بیرہ سفید چکن پر سرخ نواڑی پیٹی کس کر اور صافے کی آڑی نواڑی پٹی پر ایس ایچ کا نقرئی مونوگرام لگائے، سفید دستانے پہن کر لنچ اور ڈنر سرو کرتا تھا۔ یہ "براؤن صاحبیت" نہیں تھی بلکہ ایک سو سال سے کلکتہ، ممبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں وہ برٹس کو لونیل طرز معاشرت اختیار کر رکھا تھا جس طرح اس سے قبل اس ملک کے چند طبقات نے مغل تہذیب اپنائی تھی۔ ایک حد تک گجرات اور مہاراشٹر سمیت علاوہ جنوبی ہند کے اور اپنے گھر اور اپنے چچاؤں اور ماموؤں کے گھروں کے "کوئی ہائے" والے ماحول سے نکل کر انہی لوگوں کے اصل تمدنی اور جذباتی Hinter Land نہٹور، محلہ سادات، لانکڑی مرادآباد اور قلعہ محمود پور (ضلع مرادآباد) اور لکھنؤ چھاؤنی چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لیے جاتی تھی جہاں وہ پہلے والی مغل تہذیب کی بنیاد اور سانچہ ابھی موجود تھا تو وہ دوسرا خالص ہندوستانی انڈو مغل ایرانی تہذیبی ماحول بھی میرا اپنا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے سوشل ہسٹری بے حد فیسی نیٹ کرتی ہے اور اس کے تمام تہہ در تہہ لوازمات۔ ادب میں میں بنیادی طور پر ایک رومینٹک ہوں۔ اس وجہ سے مجھے تاریخ، ماضی اور وقت کے مسئلے سے از حد دلچسپی ہے اور اسی لیے جب کبھی لکھوں تاثراتی تنقید لکھتی ہوں۔

تو "تلازمۂ خیال" اور "شعور کی رو" کے لیے کچھ کم چیزیں تھیں؟ چنانچہ یہی "تلازمہ خیال" اور ساقی اور دوسرے ادبی رسالوں میں چھپنے والے میرے اولین افسانوں "یوں ہی"، "آہ! اے دوست"، "ایسے ہی"، "رقص شرر"، "یہ باتیں" وغیرہ میں نمودار ہوا۔ اس وقت ورجنیا وولف کا میں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ نہ ہنری جیمز اور برگساں کا۔ یہ افسانے میں نے ابھی چند ماہ قبل "ستاروں سے آگے" میں پڑھے۔ مدتوں سے یہ کتاب نایاب تھی۔ ایک خاتون نے سنبھل ضلع مرادآباد کی پبلک لائبریری سے حاصل کر کے بھیجی۔ اسے صادق الخیری نے 47 میں خاتون کتاب گھر سے شائع کیا تھا۔ (اسی سال دلی کے فسادات میں اس کا سارا اسٹاک مع پبلشنگ ہاؤس خاکستر بود ہوا) شاید منٹو نے کہیں لکھا ہے کہ جب لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ گورکی اور موپاساں سے متاثر ہیں تو انھوں نے ان مصنفوں کو پڑھا۔ خاکسار کے لیے کہا جاتا ہے کہ ہنری جیمز سے متاثر ہوں۔ تو ہنری جیمز کی ایک کتاب جو مجھے مکتبہ فرینکلن (لاہور، نیویارک) نے 54 میں ترجمے کے لیے بھیجی۔ وہ پہلا اور آخری ناول اس ناولسٹ کا تھا جو میں نے پڑھا اور میں اس سے بہت پہلے سے لکھ رہی تھی۔ برگساں کو میں نے باقاعدہ پڑھا ہی نہیں۔ البتہ شپینگلر اور ٹوئنبی کو پڑھا ہے۔ لیکن کیا انسان از خود کچھ بھی نہیں سوچ سکتا؟ نہ بقلم خود کچھ لکھ سکتا ہے؟ واضح ہو کہ نہ میں مفکر ہونے کا دعویٰ کرتی ہوں، نہ فلسفہ دانی کا۔ محض جستجو۔

از ابیلا تھوبرن کالج میں امریکن طریقۂ تعلیم کے مطابق انٹرمیڈیٹ کلاس میں ہر ہفتے ہم لوگوں کو لائبریری سے دو کتابیں لے کر ان کی "ریڈنگ رپورٹ" دینی ہوتی تھی۔ Early Teens کی دلچسپی کے مطابق میں بھی ڈکنز، کپلنگ، اسٹیونسن، لوئیزا ے، الکاٹ، ڈیوماز وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ بچپن کی ساتھی کملا جسپال ایک بے حد ذہین خاتون تھیں اور میں ان کو گرو پکارتی تھی۔ مجھ سے سینئر تھیں اور میں ان کو گرو پکارتی تھی۔ مجھ سے سینئر تھیں۔ ایک روز انھوں نے بے نیازی سے مطلع کیا کہ اسٹریم آف کونشس نس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ مجھ پر بڑا رعب پڑا کہ یہ کوئی بہت ہی زبردست چیز ہوگی۔

ایم اے میں ہم کو جدید انگریزی ناول نہیں پڑھایا گیا۔ اسی زمانے میں بنگلور کی ایک خاتون ممتاز شیریں نے بحیثیت ناقد بہت شہرت حاصل کی۔ "تکنیک کا تنوع" ان کا ایک نہایت عالمانہ مضمون "سویرا" (لاہور) میں چھپا۔ انھوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور لکھا "آپ ورجنیا وولف سے بہت متاثر ہیں۔" میں نے جواب دیا "جی ہاں ہوں۔" عزیز احمد کا خط حیدرآباد دکن سے آیا۔ آپ نے غالباً فلاں فلاں کو بہت پڑھا ہے (بہت سے جدید مغربی ادیبوں کے نام لکھے تھے)۔ ان میں سے ولیم سیرویاں کا نام مجھے اب تک یاد ہے جسے میں نے بعد میں پڑھا اور بہت پسند کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے اندر پرستھ کالج کے رسالے میں جسے میں ایڈٹ کرتی تھی۔ میرا ایک انگریزی ڈرامہ پڑھ کر پشاور سے لکھا "معلوم ہوتا ہے آپ نے فلاں فلاں مغربی مصنفین کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔" میں نے جواب دیا "جی ہاں۔" اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ پھر میں نے کملا جسپال اپنی گرو کی تقلید میں اعلان کیا کہ میں اٹریم آف کونشس نس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہوں۔ خود کو ایک صاحب نظر ادیبہ کہلانے کے شوق میں اور اپنی کم عمری چھپانے کے لیے خود کو نہایت بھاری بھرکم ظاہر کیا کہ کچھ عرصے بعد کراچی پہنچ کر پہلی بار ایک عزیز نے ورجنیا وولف کی 1950To the Light House میں پڑھنے کو دی اور وہ مجھے بے انتہا پسند آئی (میرے بھی صنم خانے اپریل 1949 میں چھپا تھا)۔ اسی زمانے میں جدید انگریزی ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسے مع ورجنیا وولف بہت پڑھا۔ خصوصاً جدید انگریزی شاعری۔ تو عرض یہ کہ ورجنیا وولف کا مطالعہ کرکے میں نے "شعور کی رو" شروع نہیں کی جیسا کہ مستقل کہا جاتا ہے بلکہ کچھ نوں ٹاں اس خاکسار نے بہت پہلے سے شروع کردی تھی۔ مجھے ایلز بتھ بوون بھی بہت پسند ہیں۔ میرے سلسلے میں ان کا ذکر کوئی نہیں کرتا لیکن ورجنیا وولف نے "سفینۂ غم دل" لکھنے سے پہلے یقیناً متاثر کیا۔ ان لوگوں کو خود تخلیقی ادیب نہ ہوں یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ شاعر کس طرح شعر کہتا ہے۔ موسیقار کیسے موسیقی کمپوز کرتا ہے۔ افسانہ نگار کیوں کر افسانے لکھتا ہے۔ یہ ایک اندرونی بے ساختہ عمل ہے۔ تکنیک کے نسخے سامنے رکھ کر نہیں لکھا جاتا۔ نہ پینٹ کیا جاتا ہے۔ جب میں نے "میرے بھی صنم خانے" لکھا اس وقت تک میں نے کوئی جدید انگریزی ناول پڑھا ہی نہیں تھا۔ نہ "آگ کا دریا" کے لیے میں نے کوئی نسخہ سامنے رکھا۔ ایک صاحب نے کہا "یہ اورلینڈو کا چربہ ہے۔" ایک نے کہا "سدھارتھ کا۔" ہمارے یہاں کوئی چیز اوریجنل کبھی ہی نہیں جاتی۔ (اورلینڈو میرے خیال میں ورجنیا وولف کا بے حد کمزور ناول ہے)۔ مجھے فرانسیسی Impressionists بہت پسند ہیں اور کانسٹیبل کی رومینٹک ریلزم بھی اور جرمن Expressionists بھی اور "فلل ڈچ ماسٹرز" بھی۔ بڑی سیدھی سی بات ہے جس طرح کی آپ کی افتادِ طبع ہوگی اسی نوع کا ادب اور آرٹ آپ کو اپیل کرے گا اور متاثر کرے گا۔

اقبال اور ایلیٹ میرے اولیا ہیں۔ دونوں نوعمری سے میرے ساتھ رہے ہیں۔ اس وقت بھی جب ایلیٹ پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آتا تھا لیکن مسحور کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اپنی دانست میں اقبال کی جو ایمجری تصور کر رکھی وہ والد مرحوم کو بتائی تھی کہ سمرقند یا بخارا ہے اور شہسوار اڑے چلے آرہے ہیں اور گلیوں میں قالین بچھے ہیں اور نہ جانے کیا کیا۔ گویا چغتائی کی تصاویر اور اقبال کے Exocative الفاظ پر مبنی تصورات معجون مرکب۔

میں اپنی مرحومہ والدہ کی طرح ایک نہایت Greagarious اور قبائلی خاتون ہوں اور ان ہی کے مانند رشتے داروں اور دوستوں کے سلسلے میں بے حد خوش نصیب۔ مجھے ہر ملک اور ہر قوم اور فرقے میں بے انتہا پرخلوص اور اچھے دوست ملے ہیں۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگالی، پنجابی، پٹھان، گجراتی، انگریز، امریکن، یوروپین، روسی، پارسی، یہودی اور یہ دوستیاں پرانی اور پائیدار اور پرخلوص ہیں۔ کہا جاتا ہے جس کے بہت دوست ہوں دراصل اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں مفروضہ قطعی غلط ہے اور میرے احباب میں متعدد اہل قلم بھی شامل ہیں۔ "معاصرانہ چشمک" والی بات بھی میری سمجھ میں بالاتر ہے۔ رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین و حضرات پر آتا ہے۔ ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز۔ دوسرے وہ لوگ جو آکسفورڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز۔ دوسرے وہ لوگ جو آکسفورڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانہ جو موڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی تھا تو میں نے یقیناً بھرت ناٹیم میں مہارت حاصل کی ہوتی۔ زمانہ بدل گیا۔ مجھ سے اگلی پیڑھی میں میری چچا زاد بہنوں کی لڑکیوں نے اپنے والدین کی اجازت اور ہمت افزائی سے باقاعدہ کلاسیکل رقص سیکھا اور اگر مجھ سے Drift کرنے کی عادت اور سستی نہ ہوتی تو میں یقیناً آکسفورڈ یا کیمبرج میں مستقل قیام کرتی۔

کہاں کی "معاصرانہ چشمک" اپنے دوستوں کی اچھی تخلیقات کے علاوہ اگر مجھے کسی بھی ادیب کی کوئی چیز پسند آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔ میں نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں انتظار حسین، خالدہ اصغر، ابوالفضل صدیقی اور آغا بابر کے افسانے جو مجھے بہت اچھے لگے فوراً ترجمہ کرکے شائع کیے۔ اس سے قبل میں ہاجرہ، خدیجہ اور کئی ادیبوں کی چیزیں انگریزی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔

معاصرین سے پرخاش اور اپنے سے سینئر ادیبوں کا مذاق اڑانا یا ان کے ساتھ بدتمیزی کے موجودہ رویے میرے لیے تعجب خیز ہیں۔ کسی Personality Problem کے فقدان کی وجہ سے میں لوگوں سے فوراً دوستی کرلیتی ہوں اور زیادہ تر لوگوں کو جو مغرور نہ ہوں، بہت اچھا اور سویٹ سمجھتی ہوں۔ میرے بہی خواہوں کو یہی شکایت ہے کہ میں ہر کس و ناکس کو بہت اچھا سمجھتی ہوں اور ان کی اصلیت نہیں پہچان پاتی۔ اس کا تجربہ مجھے اب تک نہیں ہوا۔ چند موقعوں کے اور یہ تلخ تجربے ابھی فقط پچھلے دو تین سال ہی میں بسلسلۂ ملازمت اور بسلسلۂ ادب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ماہ قبل ایک مشہور شاعرہ کراچی سے چار دن کے لیے تشریف لائیں، مجھ سے ملنے آئیں۔ میں حسب عادت ان سے نہایت خلوص اور اپنائیت سے ملی۔ دو تین مرتبہ کی سرسری ملاقات کے بعد کراچی واپس جا کر انھوں نے میرے متعلق ایک نہایت بھیانک اور لغو اور پھر اور Sick نظم لکھ کر چھپوا دی۔ جس میں میری شخصیت کو بری طرح اور انتہائی Vicious طور پر مسخ کرکے پیش کیا اور میں متحیر ہوں کہ انھوں نے ایسا کس وجہ سے کیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس طرح انھوں نے اپنے Complexes اور بیمار ذہن کا مظاہرہ کیا۔ Twisted Mind کی بھی گوناں گوں اقسام ہیں۔ ایک قسم تہلکہ خیزی کی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ چاہے کسی قسم ہی کی سہی، شہرت حاصل ہو۔ ایک صاحب نے میری ایک Major تصنیف "کارِ جہاں دراز ہے" (جلد اول) پر نہایت طویل تبصرہ شائع کیا جو تبصرہ کم اور پھکڑپن اور بالکل Unprovoked ذاتی حملہ زیادہ تھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک بیہودہ افسانہ لکھا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگ بالخصوص آج کل آخر ایسا کیوں کررہے ہیں؟ کیا اس افسوس ناک رویے کا تعلق ایسے لوگوں کی انفرادی ابنارمل نفسیات سے ہے یا اس کی کوئی سماجیاتی وجہ بھی ہے؟ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہمارے ادب میں Male Chauvinism یقیناً موجود ہے۔

میں نے آج تک کسی معاصر کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ پھر لوگ ایسے Unprovoked ذاتی حملے اور اتنے بیہودہ کیوں کرتے ہیں؟ ان سے انھیں کس طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے؟ اس قسم کے Vicious لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر میں بدنفسی اور شرارت پر اتروں تو قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے جس کے خلاف جو دل میں آئے میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

اپنی تحریروں کا مجھے کوئی Obsession نہیں ہے۔ عموماً ان کے خلاف ہی لکھا جاتا ہے۔ سو وہ بالکل جائز ہے۔ یہ ناقد کا حق ہے وہ جو چاہے لکھے۔ جب آپ کوئی چیز لکھ کر چھپواتے ہیں تو پھر آپ کو شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ اس پر کیسی تنقید ہوئی۔ لیکن خود مصنفہ پر ذاتی حملے کسی مہذب متمدن سوسائٹی کا شیوہ نہیں اور یہ ہمارے ہاں برابر ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ انگلستان اور فرانس میں خواتین نصف سترھویں صدی سے ناول لکھ رہی تھیں۔ وہاں کے سماج کو عورت کے متعلق وہ Hang Ups اور فرسٹریشن نہیں ہے جو ہمارے یہاں موجود ہے۔ 1979 آگیا لیکن ہمارے معاشرے میں خصوصاً اردو داں سوسائٹی میں ایک خودمختار کریز دومن کو ایک عجوبہ روزگار ہستی سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جو بھی قیاس آرائیاں نہ کی جائیں کم ہیں۔ ذاتی طور پر میرے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہے۔ میں نے جس مخصوص سوشل سیٹ اَپ ماحول اور فضا میں میں پرورش پائی اور زندگی گزاری وہ زیادہ تر لوگوں کے لیے ایک اجنبی دنیا ہے۔ لہٰذا میرے گھرانے کا جو Puritanical, Semi Feudal, Anglicised Liberal ماحول رہا ہے۔ وہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا اور اس کی عکاسی جو میں لڑکپن سے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کررہی ہوں وہ بھی اسی وجہ سے ہدف ملامت بنی رہی۔ میرے اندر وہ "انا" اس حد تک یقیناً موجود ہے جو ہر معقول انسان میں ہونی چاہیے لیکن خود پرست، ایغو زدہ بر خود غلط لوگوں کو میں قابل رحم سمجھتی ہوں۔ علم و دانش کے لحاظ سے خود کو عقل کل گردانتا زبردست حماقت ہے اور اس حماقت میں لوگ آسانی سے مبتلا ہوجاتے ہیں۔ آپ اگر کسی وجہ سے بھی مدمغ ہیں۔ دانشوری یا دولت و ثروت، کارنامے، سماجی مرتبہ، اقتدار، کامیابی، شہرت۔ ان چیزوں میں سے کسی کی وجہ سے آپ میں غرور آجائے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی ذہانت میں کچھ کمی ہے۔ ہمیشہ اپنے پاؤں زمین پر رہنے چاہئیں۔ ہم اور آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ نہ جاننا شروع کرسکتے ہیں۔ وہ وکٹورین پادری جس کا نام ریورنڈ چارلس ڈوج سن تھا، وہ لوئیس کیرل کے قلمی نام سے ایک کتاب لکھ گیا "ایلس اِن ونڈر لینڈ"۔ وہ آپ نے اب تک نہ پڑھی ہو تو ایک بار پڑھ لیجیے۔ وعلیکم السلام!

[فن اور شخصیت، ممبئی (آپ بیتی نمبر، جلد اول) جلد: 4، شمارہ 7، ستمبر 1978، اشاعت: مارچ 1980، ص: 208]

بحوالہ "گل صد برگ"، مرتب: ڈاکٹر مجیب احمد خاں

□□□

سلام بن رزّاق

گردش رنگ چمن — ایک تاثر

"گردش رنگ چمن" جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گی مگر "گردش رنگ چمن" کا نظارہ کرنے والی وہ آنکھ 21 اگست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی جس نے اردو فکشن کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا تھا۔

قرۃ العین حیدر اردو کی ایسی مایۂ ناز ادیبہ تھیں جنھوں نے نہ صرف اردو میں بلکہ برصغیر کی دیگر زبانوں میں بھی اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک وہ اپنے خاص دائرۂ فن میں اپنے معاصر انگریزی ادیبوں سے بھی آگے ہیں۔ فن افسانہ نگاری میں ان کا ذکر کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی جیسے قدآور افسانہ نگاروں کے ساتھ ہوتا ہے مگر ناول نگاری میں ان کا مقام پریم چند کے بعد سب سے ممتاز ہے۔ انھوں نے ایک درجن کے قریب ناول اور ناولٹ لکھے ہیں۔ "آگ کا دریا" اور "آخر شب کے ہمسفر" کے بعد "گردش رنگ چمن" ان کا اہم ترین ناول ہے۔ اس ناول میں بھی انھوں نے اپنی بیشتر سابقہ تحریروں کی طرح ماضی کی بازیافت کی ہے اور پچھلے معاشرے کے زوال اور تاراجی کی داستان کو ایک بار پھر دانشورانہ اپروچ کے ساتھ دردمندانہ لہجے میں بیان کیا ہے۔

"گردش رنگ چمن" کا منظرنامہ برٹش کولونیل عہد سے 1983 تک پھیلا ہوا ہے، جس میں برطانوی عہد کے ہندوستانی معاشرے اور تہذیب کی رنگا رنگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ بالخصوص اس عہد کی طوائفوں کی شاندار مگر حسرت آمیز اور عبرت انگیز تصویر کشی قاری کو مسحور اور متاثر کرتی ہے اور دل گرفتہ بھی کردیتی ہے۔ "آگ کا دریا"، 'کار جہاں دراز ہے' اور "آخر شب کے ہمسفر" تاریخی واقعات پر قائم ہیں۔ "گردش رنگ چمن" میں بھی تاریخ کا عمل دخل ہے مگر اس میں واقعات اور حادثات کو اس باریکی سے چھانا پھٹکا گیا ہے کہ قاری کے سامنے ماورائے تاریخ کے گمشدہ پراسرار گوشے بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ یہ ناول سات سو صفحات پر پھیلا ہے اور ایک صدی سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ کردار نگاری، واقعاتی تسلسل، ڈکشن، تکنیک، اسلوب ناول کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کے لیے بیسیوں صفحات درکار ہیں۔ یہاں ناول کے صرف ایک اہم کردار عندلیب بانو کے ذہنی رویے اور نفسیاتی کش مکش کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے جو ناول میں محور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ناول کا عنوان "گردش رنگ چمن" غالب کے مصرعے "گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب' سے ماخوذ ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے قصے کے مرکزی کردار کا نام عندلیب بانو رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ گردش رنگ چمن کی داستان دراصل ایک وسیع تناظر میں عندلیب بانو کی سرگذشت ہی ہے۔ مصنفہ نے اسی کردار کے حوالے سے دوسرے کرداروں کو متعارف کروایا ہے۔ عندلیب بانو اپنی بیٹی ڈاکٹر عنبرین کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ انھیں پینٹنگ کا شوق ہے۔ ڈاکٹر عنبرین بیگ اور ڈاکٹر منصور کاشغری دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ عندلیب بانو ڈاکٹر منصور کو تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتیں اس لیے اپنی خاندانی روداد سناتی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ عندلیب بانو اپنے وقت کی ایک مشہور طوائف گلرخ بانو عرف نواب فاطمہ کی بیٹی ہیں جو خاندانی اعتبار سے ایرانی مغل تھیں مگر غدر میں دونوں طرف کے کنبے مارے گئے اور امتداد زمانہ نے گلرخ بانو عرف نواب فاطمہ کو نواب بیگم بنا دیا۔ ابتدائی ایام میں موسیو آندرے جوزف رینال سے تعلقات کے نتیجے میں عندلیب بانو وجود میں آئیں۔ وقت اور حالات کے سبب عندلیب بانو کو بھی اپنی ماں نواب بیگم کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ عندلیب بانو کی زندگی کے ماہ و سال ہی گردش رنگ چمن کی اصل داستان ہیں۔ عندلیب بانو عمر کے اعتبار سے تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکی ہیں مگر فکری اعتبار سے وہ بے حد جدید ذہن رکھتی ہیں۔ اسی لیے تو ان کی بیٹی عنبرین بیگ انھیں 'اولڈ گرل' کہہ کر پکارتی ہیں۔

عندلیب بانو کے کردار میں ماضی اور حال بیک وقت متصادم نظر آتے ہیں، ان کے مزاج میں متضاد کیفیتیں اس طرح خلط ملط ہوگئی ہیں کہ وہ کبھی انتہائی دقیانوسی اور روایت پرست خاتون معلوم ہوتی ہیں اور کبھی اپنے عہد سے بھی دو قدم آگے نظر آتی ہیں۔ روایت پسندی کی مثال ان کی وہ سرخ پٹاری ہے جس میں انھوں نے کئی گڈے، گڑیاں سنبھال کر رکھی ہیں۔ یہاں سرخ پٹاری ان کے ماضی کی تمثیل بن جاتی ہے جس میں داستان کے مختلف کردار گڑیوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ اور وہ گاہے گاہے ان گڑیوں کے وسیلے سے اپنے ماضی میں جھانک لیتی ہیں۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گڈے گڑیوں کی شکل میں پرانی تہذیب اور معاشرے کے باقیات کی بازیافت کی گئی ہے۔ عندلیب بانو کے پاس اسلامک آرٹ پر دو ضخیم کتابیں بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کے شاندار ماضی کا علامیہ ہیں، دوسری جانب عندلیب بانو بے حد جدت پسند بھی ہیں۔

جب وہ ایک مرا قشی قالین کو دیکھتی ہیں جس پر ایک عرب شہسوار ایک حسینہ کو لیے اُڑا جا رہا ہے۔ تعاقب میں غنیم یا رقیب ہے اور اوپر تاروں بھرا آسمان، چاند، مینار اور کھجور کے درخت، تب وہ اعلان کرتی ہیں۔

''عورت کے متعلق اقوام مشرق کے رویّے ان قالینوں سے عیاں ہیں۔ اب میں ان کے سامنے سویت خلا باز لڑکی کی تصویر لگاؤں گی۔''

اس وقت تک پہلی ہندوستانی خلا باز خاتون کلپنا چاولہ منصۂ شہود پر نہیں آئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر ناول اس کے بعد لکھا جاتا تو عندلیب بانو کا ریمارک کچھ اور ہوتا۔

ان دو مثالوں سے ان کے مزاج کے تضاد کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ افسردگی، خوش طبعی، متانت اور ذہانت عندلیب بانو کے مزاج کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ وہ اپنی فطری کمزوریوں اور اپنے ماضی کی ذلتوں کو دوسروں سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتیں۔ اس لیے ساری کثافتوں کے باوجود وہ ایک لطیف احساس کی طرح قاری کے ذہن میں زندہ رہ جاتی ہیں۔

ناول کا ابتدائی حصہ دانشورانہ قسم کے مکالموں سے خاصہ بوجھل ہو گیا ہے۔ جس میں عندلیب بانو اور ڈاکٹر منصوری، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، حکمت، شعروادب اور فلسفے پر ایسی چکاچوند گفتگو کرتے ہیں کہ قاری چندھیا کر رہ جاتا ہے۔ انداز نگارش اس قدر تیز و تند ہے کہ قاری کو کہیں پیر جمانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جس طرح دریا اپنی رفتار کی مستی میں بعض اوقات اپنے کناروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ ''گردش رنگ چمن'' کے مطالعے کے دوران بھی کچھ ایسا ہی تاثر ذہن میں ابھرتا ہے۔ ناول کہیں کہیں اپنے پلاٹ کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے۔ مصنفہ نے اسے نیم دستاویزی ناول کہا ہے۔ واقعتاً یہ اردو فکشن کی ایسا نادر دستاویز ہے جس کے دامن میں پچھلے ڈیڑھ سو برس کا عہد اپنی ہولناک کی سچائیوں اور عبرت خیزیوں کے ساتھ محفوظ ہو گیا ہے۔ یوں تو قرۃ العین حیدر کے اسلوب میں سہل ممتنع کی سی شفافیت ہوتی ہے مگر ان کی سادہ اور سلیس نثر میں جگہ جگہ نگینوں کی طرح ایسے بلیغ فقرے بھی جڑے ہوئے ملتے ہیں جن سے عبارت کا حسن دوچند ہو جاتا ہے اور بے اختیار زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔ ''گردش رنگ چمن'' میں بھی ایسے معنی خیز جملے موجود ہیں جن سے مصنفہ کی فکری بصیرت اور احساس کی شدت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی آزادی سے متعلق یہ بلیغ فقرہ دیکھیے

''کہتے ہیں سمندر گا ہے گا ہے جل کر راکھ ہونے کے بعد اسی راکھ سے پھر زندہ ہوتا ہے۔ سارا ہندوستان اپنے ملبے اور راکھ میں دب کر اسی سے دوبارہ نمودار ہو رہا تھا۔'' نوابوں اور راجاؤں کی تعیش پسندی پر یہ کراری چوٹ ملاحظہ کیجیے: ''جن دنوں طواف الملو کی چالو تھی، طوائفوں سے ملوک کا بہت رابطہ رہا۔''

فسادات کی موجودہ صورت حال پر یہ فقرہ دیکھیے:

''ہر قسم کے پائیدار بلوے، مناسب اجرت پر ہمارے ہاں سے کرائیے۔''

لکھنؤ کے زوال پر عنبریں بیگ کا ریمارک:

''بقول اِنّی کبوتر اور بٹیریں لکھنؤ کو چُگ گئیں۔''

بے معنویت پر یہ معنی خیز فقرہ:

''جنگل جنگل الفاظ کے معنی تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ وہ جگنوؤں کی طرح چمک کر پھر اندھیرے میں بجھ جاتے ہیں۔''

ایک اور اقتباس

''نام سب پامال ہو چکے ہیں۔ لوگ بولتے بولتے تھک گئے ہیں۔ کم از کم دس ہزار سال سے تو باقاعدہ اور متواتر بولے جا رہے ہیں۔ اسی لیے وہ شخص جو نگار خانم کے سرونٹ کوارٹر میں زنجیروں سے بندھا چپکا بیٹھا ہے کتنا محفوظ ہے۔'' سطور بالا میں زیر تبصرہ ناول کی محض ایک ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے۔ ورنہ ناول میں اشاریت اور بلاغت کا ایک جہان پوشیدہ ہے جو ناول کے مطالعے کے بعد ہی قاری پر آشکار ہو سکتا ہے۔

□□□

پتہ:
Mira Road Post Office,
P.O. Box No. 28, Mira Road (E),
Thane 401107

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

عبدالرب

اردو تحقیق و تنقید اور گیان چند جین

گیان چند جین ہمارے ان محققین میں ہیں جنھوں نے صرف لکھنے اور پڑھنے کو اپنا وظیفہ حیات بنایا زود نویسی کے باوجود ان کے مضامین ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اترتے۔ ان کا وسیع علم اور نہایت بالیدہ تنقیدی شعور ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد درجن بھر سے زیادہ ہے اور موضوعات میں بھی کافی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے بعض کام اردو میں اپنی نوعیت کے پہلے کام کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر اب بھی بہت کچھ اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے اس سلسلے میں ان کی کتاب ''تحقیق کا فن'' پیش کی جاسکتی ہے۔

گیان چند جین کی حیثیت بنیادی طور پر ایک محقق کی ہے تاہم اپنے خیالات کے اظہار کے لیے وہ تنقید کا بھی سہارا لیتے رہے اور ان کے تنقیدی مضامین کی اچھی خاصی تعداد ایسی ہے جو کسی بھی نقاد کے سرمایے کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے۔

تحقیق میں انھیں جس کتاب نے امتیازی حیثیت عطا کی وہ ہے ''اردو کی نثری داستانیں'' یہ ان کا ڈی فل کا مقالہ ہے جس کے بارے میں رشید حسن خاں جیسے سخت گیر محقق کی رائے یہ ہے کہ ''آج اس کتاب کی حیثیت کتاب حوالہ کی سی ہے جو شخص بھی داستانی ذخیرے کے کسی بھی حصے پر اور کسی بھی پہلو پر کوئی ڈھنگ کا کام کرنا چاہے گا وہ اس کتاب سے استفادے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔''

گیان چند جین کی ایک بڑی خوبی یہ کہی جاسکتی ہے کہ سچ کے اظہار میں جھجکتے نہیں خواہ اس سے ان کی اپنی شخصیت کا کوئی کمزور پہلو کیوں نہ سامنے آتا ہو یہ ایسی خوبی ہے جو ہمارے محققین میں بہت کم نظر آتی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جنوری 1987 میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اردو کے تحقیقی مقالوں پر ایک سیمینار ہوا۔ شرکا میں جموں یونیورسٹی کے ریڈر ڈاکٹر ظہور الدین بھی تھے انھوں نے ایک زمانے میں میری نگرانی میں جموں میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ سنا ہے کہ کسی اعتراض کے جواب میں انھوں نے سیمینار میں کہا کہ میں نے ان کی ریسرچ کے دوران انھیں تحقیق کے طریقے نہیں بتائے تھے۔ ان کا یہ کہنا درست تھا، میں اس زمانے میں اصول تحقیق سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر چکا تھا لیکن وہ میرے ذہن میں ترتیب شدہ شکل میں نہیں تھے چنانچہ میں اپنے زیر نگرانی اسکالروں کو صریحاً اس کا درس نہیں دیتا تھا۔''

اس بیان سے ظاہر ہے کہ گیان چند جین دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوری کے اظہار سے بھی نہیں گھبراتے ان کی اس مزاجی کیفیت کا اظہار ان کے ان مضامین میں بھی ہوا ہے جو فراق گورکھپوری، مسعود حسن رضوی ادیب وغیرہ پر لکھے ہیں وہ تحقیق میں مکمل احتیاط کا مطالبہ کرتے ہیں اسی کے ساتھ وہ تحقیق کی زبان پر قابل مطالعہ ہونے کی شرط بھی عائد کرتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان بے پناہ لطافت رکھتی ہے اور اس میں تحقیق کی صحت کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

ایک زمانے میں گیان چند جین نے منفی تحقیق کی اصطلاح بڑی شدت سے استعمال کی تھی اور اس ذیل میں وہ قاضی عبدالودود کا نام بار بار لیا کرتے تھے۔ گیان چند جین کا سہارا ان لوگوں نے خوب لیا جو تحقیق میں تن آسانی کے خوگر تھے۔ گیان چند جین کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر مروت کو غلط نہیں سمجھتے اور تحقیق میں ان کا زور مثبت پہلوؤں کی طرف زیادہ ہے حالانکہ یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ تحقیق کی دنیا میں مثبت اور منفی کا تصور کیا معنی رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں محمود شیرانی قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی آرا ان سے مختلف ہیں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ ''اگر کسی شخص نے جھوٹ بولا ہے اور آپ کہیں کہ اس نے جھوٹا بیان دیا تو اس میں منفی پہلو کیا ہوا؟ ایک شخص نے گھٹیا درجے کا کام کیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ کام کم رتبہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ تحقیق کا مقصد تو سچ کی تلاش ہے۔''

گیان چند جین تحقیق کے مقصد کے سلسلے میں ان صاحبان کی آرا سے اختلاف نہیں کرتے لیکن چونکہ مشرقی اخلاقیات کے قائل ہیں اس لیے عام طور پر تحسین کے پہلو پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی مثالیں ان کے مضامین ''ہندوستان میں اردو تحقیق''، ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بحیثیت ماہر لسانیات'' اور ''کالی داس گپتا رضا'' وغیرہ میں مل جائیں گی جن میں گیان چند جین کا اخلاص بولتا نظر آتا ہے اور وہ کمزور پہلوؤں کے بیان سے گریز کرتے ہیں۔ دوسری طرف ''دلی اور لکھنؤ کی زبان کا معرکہ''، ''اخلاقیات تحقیق''، ''فراق کی بے عروضیاں''، ''فسانۂ عجائب کا ابتدائی متن'' جیسے مضامین ہیں، جن میں جین صاحب نے صاف گوئی اور بے باکی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ''دلی اور لکھنؤ کی زبان کا معرکہ'' میں انھوں نے جس باریک بینی سے ان ادبی مراکز کے اختلافات کا جائزہ لیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے حالانکہ ان کی ذہنی وابستگی لکھنؤ

کے تعلق سے ''فسانۂ عجائب'' کے ساتھ ظاہر ہے لیکن ان کی یہ وابستگی ان کے فیصلے پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ وہ نثر میں ''فسانۂ عجائب'' کے مقدمے کو دہلی اور لکھنؤ کے معرکے کا نقطۂ آغاز بتاتے ہیں اور اس کا بے باک تجزیہ بھی کرتے ہیں اور یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سرور چونکہ میر امن کے تتبع میں ناکام رہے اس لیے انھوں نے میر امن کے برعکس وہ اسلوب اختیار کیا جو پہلے سے رائج تھا اور جس کا تتبع آسان تھا جین صاحب لکھتے ہیں: ''اور انھوں نے پہلی بار لکھنؤ اور دلی کی زبان کو حریف قرار دیا لیکن میر امن سے ان کی کور دبتی تھی، ان کے رنگ میں ناکام ہونے کی وجہ سے وہ طیش میں آگئے، کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق وہ امّن کی اور دلی کی زبان کو۔۔۔کوسنے لگے۔''

گیان چند جین نے لسانیات اور عروض پر بھی کام کیا ہے ان کے یہ دونوں کام متنازعہ فیہ ہیں حالانکہ ان میں ان کی مہارت مشتبہ نہیں، لیکن ان کی آرا وتجاویز کو قبول نہیں کیا گیا۔ انھوں نے قدیم کلاسیکی متون کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کی مثالیں ''اردو کی نثری داستانیں'' اور ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' میں تو ملتی ہی ہیں ''دکنی و گجری شاعری میں ہندی اصناف'' اور ''دکنی کے لسانی رشتے'' جیسے مضامین میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ''اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کی جنس'' پر جس ماہرانہ انداز میں انھوں نے گفتگو کی ہے وہ اردو میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ جین صاحب نے کتابوں پر مقدمے اور تبصرے بھی بہت لکھے ہیں اور کبھی کبھی خرم و احتیاط کا دامن چھوڑ کر لکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ''گرتی دیواریں'' پر ان کا تبصرہ ہے جس کو انھوں نے عظیم ناول قرار دیا۔ عابد پیشاوری کی کتاب ''انشاء اللہ خاں انشا'' پر ان کا تبصرہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ اس کے برعکس ''مقالات طباطبائی'' پر ان کا مقدمہ ڈاکٹر اشرف رفیع کی حدود اور طباطبائی کے اردو پر احسانات کا بڑی دیانتداری سے جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں انھوں نے طباطبائی کے اس رویے کی مذمت بھی کی ہے جو جدید تنقید کے علی الرغم انھوں نے اختیار کیا تھا اور خاص مشرقی الفاظ دیگر کلاسیکی اصول نقد پر اصرار کی کوتاہیاں بھی ظاہر کردی ہیں اسی کے ساتھ وہ طباطبائی کی خدمات کے اعتراف میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے خصوصاً ان کی شرح غالب کو دل کھول کر سراہتے ہیں۔ حالانکہ گیان چند جین کی اپنی شرح اس کے متضاد رویے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے جس میں غالب کی تحسین کا انداز عام شارحین سے مختلف نہیں۔ ایک تیسری شکل گیان چند جین کے وہ مضامین پیش کرتے ہیں جو انھوں نے غالب پر لکھے ہیں اور جن میں وہ زور دیتے ہیں کہ غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر نہیں ہے۔ ان کی اپنی رائے اقبال کے حق میں ہے۔ وہ قاضی عبدالودود کو کبھی بت شکن محقق کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں تو کبھی ان کی خدمات سے یکسر انکار کر بیٹھتے ہیں (ملاحظہ کیجیے قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن) اس کا ذمے دار شاید ان کی بسیار نویسی کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

گیان چند جین کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ محقق سے تنقیدی شعور کا مطالبہ کرتے ہیں، مثلاً قاضی عبدالودود پر ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے کچھ ایسے متون مدون کیے جن کی تنقیدی قدر قیمت کچھ بھی نہیں حالانکہ ہمارے بعض ایسے متون جو ادبی اہمیت کے حامل ہیں ابھی تدوین سے اب بھی محروم ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ گیان چند جین نے خود ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کی۔

معاصر ادب پر لکھتے ہوئے جین صاحب اپنی ترجیحات کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کلاسیکی ادب کے تعلق سے ان کے سروکار بدل جاتے ہیں اور وہاں وہ اکثر کھرے محقق اور محتاط ناقد ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ کلاسیکی متون کی قدر و قیمت کے تعین میں عام طور پر وہ دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کا اصل اظہار ان کے وہ مطالعات ہی ہیں جو کلاسیکی ادب سے متعلق ہیں اور ان میں بھی ان کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

□□□

پتہ:
#265, Sabarmati Hostel,
JNU, New Delhi-67

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

راحت ابرار

پہلا انڈو جرمن شاعر: فراسو

اینگلو یوروپین شعرا میں فرانسس گاٹلیب کوئن "فراسو" (Francois Gotlieb Koin Farasoo) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اٹھارھویں صدی عیسوی کا پہلا انڈو جرمن شاعر تھا۔ وہ نہ صرف اردو اور فارسی پر دسترس رکھتا تھا بلکہ اسے ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے والد جان آگسٹائن گوٹلی کوئن جرمنی کے باشندے تھے۔ ہندوستان میں آکر انھوں نے ایک ہندو عورت سے معاشقہ کیا جس سے 1777 میں فرانسس کوئن پیدا ہوا۔

فرانسیسی شاعر جارج پیش شور (George Puech Shor) نے اپنے نانا فراسو کے حالات قلم بند کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شور نے نانا کے انتقال کے بعد موضع ہرچند پور تحصیل پرگنہ کھیکڑا ضلع باغپت میں فراسو کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس پر ایک تختی نصب کی تھی۔ شور نے لکھا ہے کہ فراسو کا انتقال ہیضے اور پیچش کے مرض میں 1861 میں چوراسی سال کی عمر میں ہوا۔ باغپت سے چھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہرچندپور میں اس کی حویلی کے باہر فراسو کی پختہ قبر کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ البتہ مقبرہ اور قبر کا کتبہ اب موجود نہیں ہے۔ قبر کے نزدیک ایک بہت پرانا کھرنی کا درخت بھی موجود ہے۔ حویلی کا صدر دروازہ آثار قدیمہ کا کوئی کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ آج کل اس حویلی پر گاؤں والے قابض ہیں۔

فرانسس کوئن فراسو کی تربیت اس کے خالو لوئی بالتھرزین ہارٹ عرف نواب ظفریاب خاں کی نگرانی میں ہوئی جو خود بھی جرمن تھا۔ ظفریاب مسلمان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اس لیے اس کے مصاحبین میں اردو اور فارسی شعرا کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ فراسو نے خیراتی خاں دلسوز دہلوی سے تلمذ حاصل کیا تھا جو افغانی تھا اور نواب ظفریاب کے رفقا میں سے تھا۔ خود دلسوز نے حکیم ثناءاللہ فراق سے کسب فیض کیا تھا۔ فراسو کا قلم ہر صنفِ سخن پر رواں تھا۔ اس نے قصیدے بھی کہے اور مثنویاں بھی لکھیں۔ غزل اور ہزل پر بھی اسے دسترس حاصل تھی۔

فرانسس کوئن فراسو کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس کے ایک منظوم خط سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے فی البدیہہ لکھ کر اپنی چھوٹی سالی کو بھیجا تھا۔ فراسو لکھتا ہے۔

عزیز از جاں عزیزہ او ر پیاری
ہمیشہ ہے تمھاری یادگاری
وہ دلی میں ہمیں پہنچا تھا نامہ
ثنا اس کی نہیں لکھ سکتا خامہ
ضرورت کا بہت ہم کو جو تھا کام
گئے تھے بھول ہم گڑیوں کا پیغام
تمھاری بہن بھی لکھتی دعا ہے
تمھاری دید اس کا مدعا ہے
جو یاں دونوں تمھاری بھانجی ہیں
تو وہ لکھتی ہزاروں بندگی ہیں

ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام میڈلا کوئن تھا جو آگے چل کر فرانسیسی ادیب اور شاعر جارج پیش شور کی والدہ ہوئی۔ رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تصنیف "یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین" میں دیوان فراسو کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک مخطوطہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا۔ دیوان کا نام "گنبد گیتی نما" تھا۔ اس میں فراسو کا اردو، فارسی اور ہندی کا تمام کلام محفوظ ہے۔ "شمس الذکا" کے نام سے فراسو نے ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جس میں اس کے خالو ظفریاب کے درباری شعرا کے سوانح اور انتخاب کلام درج ہے اور جس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا سنہ 1792 ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے فراسو کے کلام کا انتخاب اپنے رسالے "اردوئے معلیٰ" کے ضمیمے میں شائع کیا تھا۔ اسی کا انتخاب رام بابو سکسینہ نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں دیا ہے۔

کھیکڑا ڈگری کالج کے سابق پرنسپل اور باغپت کے بزرگ مورخ پروفیسر ایم این شرما نے اپنی انگریزی کتاب "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سردھنہ (1830-1750)" میں بیگم سمرو کے میر منشی گوکل چند کی مشہور تصنیف "زیب تواریخ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اینگلو انڈین شاعری میں فراسو کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور اس دور میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ فراسو بیگم سمرو کا درباری شاعر بھی تھا۔ اس نے بیگم سمرو اور اس کے بیٹے کی شان میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ بیگم سمرو کے دربار سے اسے دو سو روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ وہ بڑوت کا تحصیل دار بھی رہ چکا تھا۔

پروفیسر شرما کی تصنیف کے مطابق فراسو کے دیوان "گنبد گیتی نما" میں زیادہ قصائد ہیں جو بیگم سمرو اور ظفر کی شان میں کہے گئے ہیں۔ ضخامت 240 صفحات ہے۔ اس کا دوسرا شعری مجموعہ "جام جمشید نما" اس میں

''پدھیتی'' عنوان سے وہ بچوں کی تعلیم کی اہمیت و افادیت اور ''عشق افزا'' کے عنوان سے عشق و محبت کی کہانیاں بیان کرتا ہے، ''مقالات تعالیٰ'' میں وہ تصوف کے نکات بیان کرتا ہے، ''عصائے موسیٰ'' کے عنوان سے وہ بزرگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ وہ ''تعلیم انشا'' اور ''نسیم دلکشا'' کا بھی مصنف ہے۔ اس نے چودہ مثنویاں تصنیف کی تھیں اور لاتعداد ہندی دوہے بھی کہے ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ اس کی ایک طویل نظم بھی ہے جو بھرت پور کے قلعے کو فتح کرنے کی خوشی میں لکھی گئی ہے۔ سردھنہ دربار میں شامل ہونے والے شعرا کے کلام کا مجموعہ ''شمس الذکا'' کے عنوان سے اس نے ترتیب دیا تھا جس کا سنہ اشاعت 1799 ہے۔ منشی گوکل چند کا یہ مخطوطہ 1824 کا ہے جس میں فراسو کی ادبی سرگرمیوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

فرانسس گادلیب کوئن فراسو 1857 کی بغاوت کا بھی عینی شاہد ہے۔ جب باغیوں نے دلّی پر قبضہ کرلیا تو بہت سے انگریز افسران اپنی جان بچا کر فراسو کی حویلی ہر چندر پور میں چھپے تھے اور فراسو نے نہ صرف ان انگریزوں کو پناہ دی بلکہ بہت سے انقلابیوں کو قتل بھی کرایا، ان میں سب سے مشہور نام شاہ مل جاٹ کا ہے۔ انقلابیوں نے کئی مرتبہ فراسو کے محل پر حملہ کیا تھا مگر اس نے بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لالچ دے کر اپنے حلقے میں شامل کرلیا بغاوت کی ناکامی کے بعد حکومتِ برطانیہ نے اس کو تین گاؤں تحفہ میں دیے۔ فراسو آخری دن تک اپنی اس حویلی میں ہی رہا۔ اس حویلی کا صدر دروازہ آج بھی 1857 کی خونی بغاوت کا گواہ ہے۔ اس کے خاندان کے ایک فرد نے 1990 میں اس حویلی کو معہ تمام باغات کے فروخت کردیا تھا اور اب یہ خاندان دوسو سال بعد پھر فرانس واپس چلا گیا ہے۔

فراسو نے 1857 کے غدر کی منظوم تاریخ ''فتح نامہ'' کے عنوان سے فارسی میں لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ اور دوسرا مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس منظوم تاریخ کا عکس مضمون نگار کے پاس بھی موجود ہے۔ فراسو کا نواسہ جارج پیش شور بھی اردو اور فارسی کا شاعر اور ادیب تھا۔ جارج خود بھی 1857 کے واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس نے اردو زبان میں ایک روز نامچہ ''وقائع حیرت افزا'' تحریر کیا ہے جس میں دلّی، میرٹھ، علی گڑھ اور ہاتھرس کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ روزنامچہ ایک مخطوطے کی شکل میں مضمون نگار کے پاس محفوظ ہے۔ شور کی تصنیفات میں اردو کے چھ دیوان اور ایک مثنوی (سوانح عمری)، ایک دیوان فارسی کا اور ایک نسخہ ''وقائع حیرت افزا'' شامل ہیں۔

جارج پیش شور ایامِ غدر میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر میرٹھ منتقل ہو گیا تھا مگر اپنے نانا فراسو کی وفات کے بعد پھر ہر چندر پور چلا آیا تا کہ نانا کی جائیداد کا انتظام سنبھال سکے۔ فراسو نے اپنے والد کی طرح ایک ہندو عورت کو اپنی داشتہ بنا لیا تھا۔ خود فراسو نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

لگ گیا جس سے فراسو دل وہی محبوب ہے
عشق میں کب پوچھتا ہے کوئی نیکو ذات پات

فراسو نے اپنے انتقال سے قبل اپنی تمام جائیداد اپنی داشتہ بختی بائی کے نام وصیت کردی تھی۔ وہ عورت اپنے کسی عزیز کو جائیداد منتقل کرنا چاہتی تھی، اس لیے جارج پیش شور سے اس کی مقدمہ بازی بھی ہوئی۔

جارج پیش کا جو دیوان 1872 مطبع چشمہ علم بے خزاں، میرٹھ سے شائع ہوا ہے اس میں بختی بائی کے انتقال پر قطعۂ تاریخ وفات درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا انتقال 1865 میں ہو گیا تھا اور تبھی سے وہ اپنے نانا کی جائیداد کا مالک بن گیا اور اسی کا شمار صاحب حیثیت لوگوں میں ہونے لگا۔

ایک جرمن ہونے کے باوجود فراسو کو اردو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں شگفتگی، روانی اور آمد ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

درد ہے، غم ہے، ناتوانی ہے
مرگ کا نام زندگانی ہے

قصر تعمیر کرچکے ہیں بہت
منزلِ گور اب بنانی ہے

گر پختہ مزاج ہو تو سمجھو
ہے رشتۂ خام زندگانی

یہ صبح سے حال ہے تو کیونکر
ہوگی تا شام زندگانی

آنے کی خبر ہے تیرے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

گردش نے تری تو جی سے کھویا
اے گردشِ روز گار دل کو

قلم بھی جان پر روتا ہے میری
یہ آنسو ہیں نہ سمجھو تم سیاہی

فراسو تم سے وہ ہوتا جدا کیوں
تمھارا کچھ بھی گر ہوتا ذرا پاس

□□□

پتہ:
Aligrah Muslim University, Aligarh

نمائندہ فانا
قرۃ العین حیدر سے بات چیت

اردو ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے

سوال: آپ نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے اردو کو کیوں اظہار کا ذریعہ بنایا جبکہ آپ انگریزی پر بھی اتنی قدرت رکھتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ایک عام اردو قاری آپ کی تحریروں کی گہرائیوں کو پانے سے قاصر رہتا ہے خصوصاً آپ کا وہ طرز تحریر جس میں آپ اشاروں اور کنایوں میں تاریخی ادوار کے حوالے دیتی ہیں۔ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف مخصوص طبقے ہی میں پڑھی جاتی ہیں؟

جواب: بات ایسی نہیں ہے۔ اگر میری تصانیف عام اردو قاری کی فہم سے بالاتر ہوں تو پھر میں پوچھوں گی کہ پھر وہ اتنی زیادہ تعداد میں کیوں پڑھی جاتی ہیں۔ ہاں البتہ میں اتنا ضرور کہوں گی کہ سنجیدہ ادب، سنجیدہ طبقے اور صائب الرائے طبقے میں ہی پڑھے جاتے ہیں۔ مقبول عام لٹریچر کی صنف دوسری ہے جیسا کہ گلشن نندہ اور ابن صفی جن کو صحیح معنوں میں عوامی ادیب کہہ سکتے ہیں۔

اردو میری مادری زبان ہے اور میں اردو میں کیوں نہ لکھوں؟ میں جس طرح کی چیزیں لکھتی ہوں ان کا انگریزی میں موثر طور سے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے۔ یہ فضا سازی انگریزی میں نہیں ہوسکتی۔

سوال: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کا ناول "آگ کا دریا" جس تہذیبی ماحول کا عکاس ہے وہ آج کے ہندوستان کے حالات سے بھی مناسبت رکھتا ہے؟

جواب: ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی جانے والی زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کے پس منظر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ہی عکاس ہوتے ہیں۔

سوال: اردو ناول اپنی منظر کاری میں متمول اور جاگیردار گھرانوں کے گرد ہی کیوں گھومتے ہیں اور اردو شاعری جام و ساقی کی بندشوں سے آزاد کیوں نہیں ہوتی؟

جواب: ایسا نہیں ہے۔ اردو میں بھی ہر قسم کے ادیب، مصنف، شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ پریم چند دیہی ماحول اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عکاس تھے، عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کے ماحول کو پس منظر بنایا۔ حیات اللہ انصاری کا آنے والا ناول "لہو کے پھول" دیہی پس منظر پر مبنی ہے۔

اردو ادب انتہائی جدید اور انتہائی توانا ادب ہے اور نئے رجحانات کی عکاسی میں دیگر زبانوں کے ادب سے پیچھے نہیں۔ اردو ادب کو ایک ہی ہیئت پر مرکوزیت کا شکار کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اسی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

سوال: آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں آپ کا نقطۂ نظر نہ جدت پسندوں سے میل کھاتا ہے نہ قدامت پرستوں سے؟

جواب: ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ آزادی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ آزادی کی حدود اس طرح متعین کی جانی چاہئیں کہ وہ ماحول کی ضروریات کے مطابق ہوں اور کسی کو سماجی طور سے نقصان نہ ہو۔ حد سے زیادہ آزادی سے مغرب میں جو نقصان ہو رہا ہے ظاہر ہے۔ اس حد سے زیادہ تجاوز کردہ آزادی نے خاندانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔

سوال: "گردش رنگ چمن" میں آپ نے تصوف کو مسترد بھی کیا ہے اور سراہا بھی ہے؟

جواب: میں نے اس موضوع پر مکمل غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز سے گفتگو کی ہے۔

سوال: مشرقی یورپ اور روس میں کمیونزم اور سوشلزم کی پسپائی سے آپ کے خیال میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

جواب: اب کوئی ترقی پسند تحریک باقی نہیں رہی۔ یہ تحریک بہت قبل ہی ناکام ہو چکی ہے۔ حالات میں مسلسل تغیر آتا رہا ہے بلکہ کئی "ترقی پسند" خود اپنے ان کٹر نظریات کو ترک کر چکے ہیں۔ تیسری دنیا کے مصنفین پر ان تغیرات کا اثر لازمی ہے کیونکہ ان ادبا اور مصنفین نے بشمول میرے، یہ تصور کیا تھا کہ ہمارے مسائل کا حل ایک مخصوص قسم کی اشتراکیت میں ہے جو ہندوستان کے حالات سے مطابقت رکھتی ہو اور جو مذہب پسند لوگوں کو الگ نہ کرے۔

اب تو حالات بہت بدل چکے ہیں اور مذہب کا روس اور چین میں بھی احیا ہو رہا ہے، میں بھی دوسروں کی طرح ہی دم بخود ہو کر ان تغیرات کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔

سوال: آپ فی الوقت کون سا ناول تصنیف فرما رہی ہیں؟

جواب: "چاندنی بیگم"

سوال: آپ اپنی تخلیقات میں کسے شاہکار سمجھتی ہیں؟

جواب: میرا آخری ناول ہی میرا شاہکار ہوگا۔

□□□

(گیان پیٹھ ایوارڈ پانے کے بعد قومی آواز، 25 جولائی 90)

غضنفر اقبال

پروفیسر عتیق اللہ سے گفتگو

سوال: آپ نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ درس وتدریس میں گزارا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بعض اعتبار سے اس کی اپنی چند خصوصیات ہیں۔ ایم اے کی تعلیم کے علاوہ ایسے دوسرے نصابات بھی ہیں جو دوسری جامعات میں نہیں۔ اساتذہ کی تعداد بھی وہاں زیادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہاں کے طلبہ کی کارکردگی اور ان کے نتائج بھی تسلی بخش کہے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ آپ خود صدر شعبہ کے عہدے پر فائز رہے ہیں اس ضمن میں آپ کا اپنا تجربہ کیا ہے؟

جواب: ارے بھائی اتنے بہت سے سوالات آپ نے ایک ساتھ کردیے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔ میں نے 29 برس اس شعبے میں گذارے ہیں۔ ہمارے بزرگ اساتذہ میں بانی شعبہ خواجہ احمد فاروقی کے علاوہ پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، پروفیسر فضل الحق، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر صادق، ڈاکٹر فرحت فاطمہ، پروفیسر امیر عارفی اور ڈاکٹر شریف احمد جیسے اہم لوگ تھے جن کے ساتھ میں نے ایک بڑا وقت گزارا۔ بعد کی نسل میں ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر ریحانہ خان کے نام آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقریباً ان تمام ناموں اور ان کے کاموں سے بھی آپ خود بخوبی واقف ہوں گے۔ بزرگوں میں بھی ایک دوسرے کے درمیان اشتراک کی کمی ضرور تھی، لیکن بعض اخلاقی رواداریوں کا سبھی نے خیال رکھا۔ سبھی کی پہلی دلچسپی تعلیم وتعلم سے ہی تھی۔ اتنی اہم اور بڑی یونیورسٹی میں ہونے کے ناتے کم صلاحیت کے باوجود بعض حضرات کو مختلف علمی وادبی اداروں میں اہم اعزازی عہدے بھی مل جاتے ہیں۔ جن پر وہ ہمیشہ قانع رہتے ہیں۔ قمر رئیس اور گوپی چند نارنگ جیسے حضرات کا تعلق بھی اس شعبے سے رہا ہے۔ ادبی سیاست کے علاوہ ان حضرات کے علمی سلسلے باہر کی دنیا سے ملتے تھے جن سے انھیں اندرونِ ملک اپنی جمعیت سازی میں کافی مدد ملی۔ لیکن انھوں نے ادبی کاموں سے بھی غفلت نہیں برتی۔ بعد کی نسلوں میں اس سرگرمی کا فقدان ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہی ہوا کہ آپ موجودہ تعلیمی ماحول سے مطمئن نہیں ہیں؟

جواب: میرا ہی نہیں، بیشتر لوگوں کا یہی خیال ہے۔ خود ہماری نئی نسلیں یہ محسوس کررہی ہیں۔ جو نئے تقررات عمل میں آئے ہیں، ان میں یہ احساس شدید ہے اسی لیے یہ نوجوان شعوری طور پر اپنے عہد کے ادبی رسائل اور ادبی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض دوزبانی ہیں۔ ترجمے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بعض اسٹیج سے اپنا تعلق بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ کر گزرنے کے حوصلوں کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ ان کا سفر ابھی شروع ہوا ہے۔ کاش یہ کسی گروہ بندی کا شکار نہ ہوں۔ شعبے سے باہر کے بڑوں کی گروہ سازی انھیں اپنی راہ سے نہ بھٹکادے۔ اپنے پیشے سے انھوں نے انصاف کیا تو آہستہ آہستہ ادب ان کی ضرورت بن جائے گا۔

سوال: آپ کے نزدیک تنقید کا کون سا دبستان زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیا آپ کے ذہن وفکر کی تعمیر میں کسی خاص دبستان کا حصہ رہا ہے؟

جواب: اردو ادب کے ایک طالب علم اور استاد کی حیثیت سے میرے مطالعے میں تقریباً سارے ہی دبستان رہے ہیں۔ ہر دبستان کے نظام فکر اور طریق کار میں بعض چیزیں کارآمد ہوتی ہیں۔ ان سے ہم کچھ نہ کچھ نیا علم ضرور حاصل کرتے ہیں۔ اپنی ترجیحات کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر دیکھیں تو ہمیں ہر مکتب فکر میں کوئی ایسی چیز ضرور مل جائے گی جس سے ہم اپنے مطالعات کو زیادہ متنوع، فکر انگیز اور معتبر بناسکتے ہیں۔ کم از کم مجھے ہر رجحان اور نظام فکر وخیال بعض سطحوں پر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کسی ایک رجحان کو کبھی اپنی عادت نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی ذاتی پسند پر زیادہ قانع ہوں۔ بیش تر تخلیق کا براہ راست مطالعہ ہی میری ترجیح ہوتی ہے یوں بھی ہر تخلیق کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اسی نسبت سے ہمارے طریق استدلال میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کو میں بے حد پسند کرتا ہوں۔ بیدی کے فکر وفن پر وارث علوی اور گوپی چند نارنگ کے مضامین میری نظر سے گزر چکے تھے۔ میں مسلسل غور کرتا رہا کہ بیدی مجھے کیوں اتنا پسند ہے۔ میں اپنی پسند کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ ایسا نام جو دوسروں کے رکھے ہوئے ناموں سے کچھ مختلف ہو۔ کافی عرصے کے بعد میں نے بیدی کے یہاں ان چیزوں کو ڈھونڈ نکالا جنھیں دوسرے نقادوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ مجھے بیدی کے 80 فیصد افسانوں میں رشتوں کا عجیب وغریب نظام کام کرتا ہوا دکھائی دیا۔ بیدی کے کرداروں میں ایسی نامانوس علاحدگیاں جنم لیتی ہیں، جن کا احساس خود

ان کرداروں کو نہیں ہے۔ کہیں ان کی محرک انکی برخود غلط انا ہے۔ کہیں کوئی مغالطہ یا غلط اندیشی اور کہیں ان کی Self Righteousness یا نفسیاتی عدم فہمی اس قسم کی علاحدگی کا باعث بن جاتی ہے۔ کہنے کا مقصود یہ کہ بیدی کو سمجھنے کے لیے مجھے کسی خاص مکتب فکر نے راہ نہیں دکھائی بلکہ براہ راست مطالعے ہی نے بیدی کی گرہوں کو اس طور پر کھولا کہ گویا میرے لیے بیدی کا ایک نئی صورت میں انکشاف ہوا۔

سوال: موجودہ تنقید سے کیا آپ مطمئن ہیں۔ بہت پہلے کلیم الدین احمد نے یہ الزام لگایا تھا کہ ہمارے یہاں ابھی تنقید، پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے اسے معشوق کی مرہوم کمر سے تعبیر کیا تھا۔ حالی کے بعد ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کلیم الدین احمد صحیح تھے؟

جواب: پہلے تو میں آپ کے اس سوال کا جواب دینا چاہوں گا کہ میں اپنے عہد کی تنقید سے کس حد تک مطمئن ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بہتوں کو اتفاق ہوگا کہ ہمارے دور کا بیشتر ادب، تنقید کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ہماری تنقید کا ایک بڑا حصہ بلاواسطہ تخلیقی ادب کے مطالعے سے گریز کی مثال ہے۔ تنقید نے عمومی طور پر جن معیاروں کی ترویج کی اور جن نقادوں کے قبضے میں زیادہ سے زیادہ ابلاغ کے ذرائع تھے اور جن کے حاشیہ برداروں کی ایک بڑی جماعت ان کی تشہیر واشاعت میں پیش پیش تھی۔ انھیں کا سکہ، سکۂ رائج الوقت کہلایا۔ اس سارے عمل میں ادیب کا تو کچھ بھلا ہوا نہیں، بلکہ خسارہ ہی اس کے حصے میں آیا۔ البتہ نقادوں کی مملکتوں میں غیر معمولی توسیع ہوئی۔ باصلاحیت مگر دور دراز کے شہروں میں رہنے بسنے والے ادیب تنقید کے بڑبولے پن کو سمجھنے والی فہم اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے، ہمارے قریب ترین ماضی کی شاعری میں چند ناموں کو چھوڑ کر زیادہ تعداد ان شعرا کی ہے جو نقادان کرام کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے انھیں کے رہ نما اصولوں کے مطابق خود کو صرف کرتے رہے۔ ایک بات اور، ہمارے بعض بزرگوں نے تنقید کے میدان میں جو نمایاں کام انجام دیے ہیں ان سے کسے انکار ہے۔ لیکن کوئی دوسرا اگر انھیں سوال زد کرتا ہے تو یہ اسے اپنی توہین پر محمول کرتے ہیں۔ میرے تنقیدی مضامین کے تازہ مجموعے ''تعصبات'' کے حرف اول اور حرف آخر کی اساس یہی مسئلہ ہے۔

سوال: جہاں تک میرے علم میں ہے، ''تھیوری'' پر لکھنے والوں میں آپ کا نام بار بار لیا جاتا ہے۔ آپ نے تھیوری پر کئی مضامین لکھے ہیں۔ ''شعر وحکمت'' حیدرآباد میں آپ کا مضمون ''مطالعاتی ترجیحات اور نئی تھیوری'' شائع ہوا ہے۔ ایک بات ہم طالب علموں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ''تھیوری'' کو خوش آمدید کہنے والے کم ہیں اسے شک کی نظر سے دیکھنے والے بہت زیادہ ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ محض مغرب کی نقالی ہے۔ ہمارے ادب کا سیاق و سباق الگ ہے۔ ہمارا ترقی پذیر ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے؟ تعلیم، علاج اور غربت کے مسائل ہی ہم حل نہیں کر پاتے ہیں۔ جب ہماری پس ماندگی کا یہ عالم ہے تو امریکہ اور یوروپ جیسے ترقی یافتہ ممالک کی ادبی تھیوریوں کا اثر قبول کرنا کہاں تک درست ہوگا؟

جواب: دراصل میں مشرق و مغرب کی اس سخت قسم کی تخصیص کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جس کی تعریف و توضیح نفرت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ صدیوں قبل مغرب نے ہم سے بھی کئی سطحوں پر خوشہ چینی کی تھی۔ ہم میڈیسن میں نئی سے نئی تحقیقات سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان دریافتوں کے لیے کمر توڑنے والے اور سر پھوڑنے والے یورپ یا امریکہ ہی کے کسی گوشے میں منہمک ہوتے ہیں۔ نئی سے نئی ٹکنالوجی کو اپنی زندگی کا روزمرہ بنانے میں تو ہم کوئی توقف نہیں کرتے اور نہ ہی یہ سوچتے ہیں کہ یہ مغرب سے درآمد کی گئی ہے۔ حیاتیات، کیمیا اور طبعیات کے علاوہ دیگر علوم انسانیہ کے شعبہ جات میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ یا وسعت آئی ہے۔ ان سے ہم بے جھجک کچھ نہ کچھ اخذ کرہی رہے ہیں۔ اب اگر علم کی سطح پر کوئی تھیوری ہمارے موجودہ تصورات کو نشان زد کرتی ہے یا گذشتہ مسلمات اور انعامات کو چیلنج کرتی ہے تو اس چیلنج کو قبول کرنے میں کیا قباحت ہے حالی نے جب ایک نیا نظریہ دینے کی کوشش کی تھی تو ان کے نظریے کو انگیز کرنے میں کافی وقت لگا حالی نے Deconstruct کیا تھا اور تنقید کو ایک مرتب اور مہذب کردار مہیا کرنے کی سعی کی تھی۔ چوں کہ ہمارے لیے وہ نامانوس تھا اس لیے اس کا مذاق اڑایا گیا۔ ترقی پسند تصورات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھیں بھی ہضم کرنے میں بڑا وقت لگا۔ جدیدیت کو ترقی پسندوں نے زوال پرست اور رجعت پسند تحریک کا نام دیا تھا۔ محمد حسن اور وحید اختر نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا اور جدید نقادوں نے ترقی پسندی کو ذہن و ضمیر کی آزادی کا دشمن قرار دیا۔ قدامت پرستوں نے نہ ترقی پسندی کو قبولیت بخشی اور نہ جدیدیت ہی کو وہ گوارہ کر سکے۔ ہر نئی تحریک نئے رجحان یا نئے تصور کو قبول کرنے والی نوجوان نسل ہی ہوتی ہے۔ پیش رو نسلوں کی جس ماحول میں تربیت ہوتی ہے یا جن نظریات کی توسیع واشاعت میں وہ اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ کھپا چکی ہوتی ہیں، ان سے یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فوراً اپنے سانچے توڑ دیں گے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ترقی پسندی یا جدیدیت کے سیاسی سروکار کیا تھے؟ ہمیں تھیوری کی علمی بنیاد سے غرض ہونی چاہیے کہ وہ ادب فہمی یا زندگی فہمی میں ہماری کس قدر معاون ہو سکتی ہے؟ کیا وہ ایسا کوئی نیا علم، نئی آگہی یا نئی فکر ہمیں دے سکتی ہے۔ جس سے ہم تاحال نابلد تھے۔ تاہم اس ساری تاویل و تعمل کے بعد میں یہی کہوں گا

اور اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ ادب براہِ راست زندگی کے مطالعے کا متقاضی ہوتا ہے۔ کسی تھیوری یا کسی نظریے سے ہم اپنے ذہن کو جلا بخش سکتے ہیں لیکن پورے طور پر اسی پر قانع ہونے کے معنی اپنی بصیرت، اپنی حسیت اور اپنی فہم کی صلاحیت پر شک کرنے کے ہیں۔

سوال: آپ نئی نسل کو کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

جواب: بھائی ویسے تو نصیحت کرنے والا اور نصیحت سننے والا دونوں بے وقوف ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ نئی نسل جو نوجوانی کے اپنے نشے میں سرشار ہے، ہماری باتوں پر کان دھرے گی۔ گذشتہ ادب کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ پیش رو نسل، پس رو نسل کو ہمیشہ کم تر اور کم کوش خیال کرتی رہی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتی کہ اس کے پاس چالیس، پچاس برس کا تجربہ اور ریاض ہے، جب کہ نئی نسل کے پاس صرف جذبہ ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ علم اور تجربے کے ساتھ اس کی تخلیقی حس کو بھی جلا ملتی ہے۔ وہ مختلف متون کی قرأت اور فہم کے تجربے سے گزر کر اور ادبی روایات اور رسومیات کا علم حاصل کرکے ہی اپنی راہ کا تعین کرنے میں کامیابی کی منزل سر کرتی ہے۔ آجکل بالعموم جو زبان استعمال کی جا رہی ہے۔ وہ روزمرہ سے بہت قریب ہے۔ اردو لسانِ شعری کی جو طویل روایت ہے اس کا اثر نئی نسل پر کم سے کم، اس لیے ہے کہ کلاسیکی شعر و ادب سے ان کی واقفیت سرسری سی ہے۔ انھیں پچھلی سی صحبتیں اور مجلسی زندگی بھی میسر نہیں آئی جس کا حصہ ذہنی تربیت میں بہت بڑا ہوتا ہے۔ پھر بھی ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں میں سے ایسے نوجوان سامنے آتے رہیں گے جو مسلسل ریاض و اکتساب کے ذریعے ہماری بہترین اقدار اور روایات کی توسیع کریں گے اور اپنی انفرادیت کے لیے بھی کوشاں رہیں گے۔

□□□

پتہ:
SAIBAN Zubair Colony,
Hagarga Cross,
Ring Road,
Gulbarga - 585104 (K.S.)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1996 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

ریتا بھٹاچاریہ

موبائل فون کی ریڈیائی لہروں کے اثرات

موبائل بیشک کم طاقت والا ریڈیشن پیدا کرتا ہے تاہم اس کا لگاتار یا زیادہ دیر تک استعمال کان کے ذریعہ ہمارے دماغ اور نروس سسٹم کو متاثر کرسکتا ہے جس کے نتیجے میں جسم کے ions میں تبدیلی آتی ہے۔ کیلشیم کی کمی واقع ہوسکتی ہے اور جسم کے دفاعی نظام کی قوت میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے نیز کئی قسم کی الرجی کا بھی امکان بڑھ جاتا ہے۔ کئی محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موبائل ٹاوروں یا پھر سیل فون کے انٹینا سے نکلنے والی توانائی ان کے آس پاس رہنے والوں کی جلد اور دماغ کے باہری حصے کو متاثر کرتی ہے۔ ان اثرات کی بنا پر ہمارے جسم میں توازن کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور سر درد، سستی، نیند کی کمی، بہراپن اور ہائی بلڈ پریشر جیسے مواد جن کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ریڈیشن کی وجہ سے کئی بائلوجیکل اثرات بھی ہوتے ہیں جیسے ڈی۔ این۔ اے کا ٹوٹنا، مختلف قسم کے پروٹینوں کا بڑھ جانا وغیرہ۔ چوہوں پر کیے گئے تجربات سے پتہ چلا ہے کہ جب انھیں زیادہ طاقت والے ریڈیائی علاقوں میں رکھا گیا تو ان کی یادداشت پر اس کا منفی اثر ہوا۔ بیشک الگ الگ انسانوں پر ایسے ریڈیشن کا اثر الگ الگ ہوسکتا ہے لیکن خطرے کو غیر حقیقی کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور پر بچے اس کی زد میں جلدی آسکتے ہیں۔ یہاں میں یہ مثال دینا چاہوں گا کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سگریٹ پینے سے کینسر ہوتا ہے لیکن اس سے سبھی کو تو کینسر نہیں ہوتا۔ اسی طرح موبائل فون یا ایسے ہی دوسرے آلوں کی وجہ سے مختلف لوگوں پر اثر کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ ابھی خطرے کے امکانات کو بھلے ہی پوری طرح ثابت نہیں کیا جاسکا ہے لیکن کیا کروڑوں موبائل فون رکھنے والوں کو امکانات کے سچ ہونے تک بے پروا چھوڑا جاسکتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے وہ یہ کہ ابھی تک کی گئی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ موبائل فون سے نکلنے والی ریڈیائی لہریں غیر برقی ہوتی ہیں اس لیے کہ ان سے پیدا ہونے والی توانائی جینیٹک نقصانات کی وجہ نہیں بنتی۔ موبائل فون اور ان کے Base station سے ہونے والے ریڈیشن دراصل اس سطح سے پچاس ہزار گنا کم ہوتے ہیں جہاں صحت پر اس کے مضر اثرات ہو سکتے ہیں۔ دوسرے موبائل فون سے نکلنے والی توانائی ایک واٹ سے بھی کم (0.2-0.6) واٹ ہوتی ہے۔ موبائل فون کے ریڈیائی علاقے کو لیکر دنیا میں کافی تشویش ہے اس لیے WHO سے لیکر ICMR تک میں اس کے بارے میں کئی تحقیقات ہوئی ہیں لیکن ان تحقیقات سے یقینی طور پر یہ ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ موبائل فون کا استعمال یا موبائل ٹاوروں کے نزدیک رہنے سے انسانی صحت کو یقینی طور پر کوئی نقصان ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں ICMR کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ایم۔ کے۔ گانگولی کی صدارت میں کمیٹی نے یہ رائے دی تھی کہ ابھی اس قسم کے ریڈیائی علاقے اور انسانوں کی صحت پر پڑنے والے مضر اثرات کے درمیان کوئی رابطہ ہونے کے وافر ثبوت نہیں ملے ہیں۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی کمیشن برائے ریڈیائی پروٹکشن اور خود WHO نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ موبائل فون وغیرہ سے پیدا ہونے والے ریڈیو فریکونسی توانائی اس محفوظ حد سے کم ہے جو انسانی صحت کے نقطۂ نظر سے طے کی گئی ہے۔ لہٰذا موبائل فون کو شک کی نگاہ سے دیکھنے اور اس کے Base Station کو خطرے کی وجہ سمجھنے کی بجائے لوگوں کو ان کی ٹکنالوجی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بشکریہ روزنامہ ''نوبھارت ٹائمز'' دہلی، 30 اگست 2007
ہندی سے ترجمہ: ایس۔ ایس۔ رضا

□□□

پتہ:
C-320/2, Shaheen Bagh
Abul Fazal Enclave-II
Okhla, New Delhi-110025

عبید الرحمٰن

بدلتا ہوا ماحولیاتی نظام اور ہم

آج عالمی سطح پر ماحولیاتی نظام میں تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں۔ موسموں کا مزاج بدل رہا ہے جس کا اثر مختلف مقامات پر خاصا نمایاں ہے۔ یہ ماحولیاتی تبدیلیاں خاص طور پر درجۂ حرارت میں اضافے کی وجہ سے رونما ہورہی ہیں۔ گذشتہ صدی کے دوران زمین کے اوسط درجۂ حرارت میں 1°F کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا تھا جس میں مزید اضافہ ہی ہورہا ہے اور مستقبل قریب میں اس میں کمی آنے کے آثار نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اگلے چند برسوں بعد پیدا ہونے والا بچہ یہ نہ جان پائے کہ قطبی ریچھ (Polar Bear) اور پینگوئن (بحری پرندہ) کسے کہتے ہیں۔ اس بچے کے نقشے سے سندربن یا مالدیپ غائب ہوچکا ہوگا۔ اس کے زمانے کا چینئی (مدراس) میرینا بیچ سے محروم ہوچکا ہوگا۔ ہندوستان کے حوالے سے گفتگو کریں تو Indian Institute of Tropical Meteorology (IITM)، پونے کے مطابق گذشتہ سو برسوں میں ہندوستان کا درجۂ حرارت 0.5°F بڑھ چکا ہے اور یہ اضافہ گذشتہ بیس سے تیس برس میں زیادہ ہوا ہے۔ ایسا قیاس ہے کہ اکیسویں صدی کے اختتام تک درجۂ حرارت میں 3°F تک اضافہ ہوجائے گا اور موسم سرما میں ٹھنڈ برائے نام پڑے گی۔

بدلتے ہوئے ماحولیاتی نظام سے مقامات کی خصوصیات بھی متاثر ہورہی ہیں۔ مثلاً کشمیر میں ایک موسم Sonth کہلاتا تھا جو اب غائب ہوچکا ہے۔ دارجلنگ جہاں کا انتہائی درجۂ حرارت 14°F ہوا کرتا تھا اب وہ 28°F کو چھو رہا ہے۔ ہمالیہ کی وادی میں پایا جانے والا ایلئتھوریم نام کا پودا جو 1,220 میٹر پر ملتا تھا اب وہ شمال میں 2,285 میٹر پر پایا جارہا ہے یعنی اپنی اصل اونچائی سے زیادہ اونچائی والی جگہ پر مل رہا ہے۔ اسی طرح یورپ میں پودوں کی کئی انواع ایسی ریکارڈ کی گئی ہیں جن میں پہلے کی بہ نسبت پھول اب ایک ہفتے قبل کھلنے لگے ہیں اور خزاں کا وقت تقریباً ایک ہفتہ آگے بڑھ گیا ہے۔ متعدد پرندوں اور مینڈکوں کی نسلوں میں پہلے کی بہ نسبت بچے جلدی پیدا ہونے لگے ہیں۔

قطب شمالی میں موجود برف پر درجۂ حرارت میں اضافہ نوٹ کیا گیا ہے۔ اس صدی کے اختتام تک قطب شمالی کے درجۂ حرارت میں 7 سے 13°F کے اضافے کا امکان ہے۔

گلیشیر برف کی بڑی چادر ہے جو میٹھے پانی کا ذخیرہ ہے۔ دنیا کے کئی بڑے گلیشیر پگھل رہے ہیں۔ امریکہ کا مونٹانا نیشنل پارک 1910 میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت وہاں 150 گلیشیر تھے جن میں سے اب صرف 30 ہی باقی بچے ہیں۔ تنزانیا میں ماؤنٹ کلی منجارو کی برفیلی پرت 1912 سے اب تک 80 فیصد کم ہوچکی ہے اور خدشہ ہے کہ 2020 تک یہ پوری طرح ختم ہوجائے۔ گلیشیر جب پگھلتے ہیں تو ان سے پانی سمندروں میں پہنچتا ہے اور ان کی سطح کو اونچا کرتا ہے۔ چین کے 681 موسم اسٹیشنوں پر سائنس دانوں نے نوٹ کیا ہے کہ درجۂ حرارت میں اضافے کے سبب سے تبت کے پٹھار' جسے دنیا کی چھت' کے نام سے جانا جاتا ہے، وہاں گلیشیر پگھلنے کی رفتار تشویشناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ چین کے کل گلیشیر کا 47 فیصد اسی پٹھار میں ہے جو سالانہ 7 فیصد کی شرح سے پگھل رہا ہے۔ اس کا نتیجہ خشک سالی، ریگستانوں میں توسیع اور دھول بھری آندھیوں کی شکل میں ظاہر ہورہا ہے۔ تبت موسم بیورو کے مطابق 1980 کے بعد سے تبت میں اوسط درجۂ حرارت 2°F بڑھ چکا ہے۔ چین میں 30 کروڑ افراد گلیشیر کے پانی پر منحصر ہیں اور یہ گلیشیر خشک ہوتے جارہے ہیں لہٰذا 400 سے زائد شہروں میں پانی کی قلت ہے جن میں بیجنگ بھی شامل ہے۔ گلیشیر کے ختم ہونے کا اثر قطبی علاقے کے ریچھ، تیندوے، سیل اور پینگوئن، کی نسلوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ پینگوئن کی 17 انواع میں سے 10 پر آفت آچکی ہے اور یہ اختتام کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ گلیشیر کا تیز رفتار سے پگھلنا دنیا کی کئی بڑی ندیوں کو خطرناک بنا دے گا۔ ان کے پگھلنے سے پہلے تو سیلاب آئیں گے مگر پھر ندیاں خشک ہوجائیں گی کیوں کہ جب گلیشیر ہی باقی نہیں رہیں گے تو پانی کہاں سے آئے گا۔ گنگا بری طرح متاثر ہوگی اور اس کا زرخیز علاقہ بنجر ہوجائے گا۔

ماحولیاتی تغیر نے گذشتہ صدی کے دوران سمندروں کی سطح میں اوسطاً 4 تا 8 انچ کا اضافہ کردیا ہے۔ اس صدی میں یہ اضافہ 3 فٹ تک پہنچ سکتا ہے۔ دراصل سمندروں کا گرم درجۂ حرارت پانی کی سطح کو بڑھا رہا ہے کیوں کہ حرارت سے پانی پھیلتا ہے اور جب سمندر پھیلتے ہیں تو جگہ بھی زیادہ گھیرتے ہیں۔ سمندر کے کنارے والے علاقے اس سے بہت متاثر ہوں گے۔ سمندری سطح میں 1.5 فٹ کا اضافہ سمندری ساحل کو 50 میٹر آگے بڑھا دے گا اور اتنی ہی زمین سمندر میں غرق ہوجائے گی۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ساحلی علاقوں میں رہنے والے کم وبیش 6 کروڑ افراد اس سے متاثر ہوں گے۔ اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اسی صدی میں ممبئی پوری طرح پانی کے اندر ڈوب جائے گا۔ یہی صورت حال کولکاتا، ماریشس اور سنگاپور وغیرہ کے لیے بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

ان اندیشوں کے باوجود ماحولیاتی تبدیلیاں ابھی پوری طرح ہماری توجہ کا مرکز نہیں بن رہی ہیں۔ ہم اسکولوں میں ان کی بابت کوئی خاص تعلیم نہیں دے رہے ہیں۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہ ماحولیاتی تبدیلیاں کیوں واقع ہورہی ہیں۔ فیڈرل کلائمٹ چینج، نامی سائنسی تحقیقاتی پروگرام کے مطابق یہ

موسمیاتی اور ماحولیاتی تبدیلی کا رجحان صرف قدرتی عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ برطانیہ کے موسمیاتی ادارے کے پیٹر تھورن کے مطابق زمینی آب و ہوا پر انسانی کارروائیوں کا بہت واضح اثر پڑا ہے۔

دراصل کارخانوں کے قیام اور جنگلوں کی کٹائی سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار 1950 کے بعد بہت زیادہ بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ میتھین اور نائٹرس آکسائڈ کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بھاپ بننے کی شرح میں بھی تیزی آئی ہے۔ یہ سب گرین ہاؤس گیسیں ہیں جن کے اثرات درجۂ حرارت میں اضافے کا اشاریہ ہیں۔ سورج کی روشنی فضا میں داخل ہوتی ہے اور گرین ہاؤس گیسوں کی چادر سے گزرتی ہے۔ جب یہ زمینی سطح تک پہنچتی ہے تو زمین، پانی اور حیاتی کرہ (Biosphere) یعنی وہ جگہ جہاں انسان، حیوانات و نباتات زندہ ہیں، یہ سب سورج کی روشنی سے توانائی جذب کرتے ہیں۔ ایک بار جذب ہوجانے کے بعد یہ توانائی واپس فضا میں بھیج دی جاتی ہے۔ اس توانائی کا کچھ حصہ خلا میں لوٹ جاتا ہے مگر اس کا بڑا حصہ فضا میں گرین ہاؤس گیسوں کے ذریعے جذب کرلیا جاتا ہے جو زمین کی طرف واپس لوٹتا ہے اور ہماری زمین کو گرم رکھتا ہے۔ یہ عمل ضروری ہے۔ اس کے بغیر زمین اس قدر سرد ہوجائے گی کہ یہاں انسانوں یا حیوانوں کی رہائش ممکن نہ ہوسکے گی مگر اس کے برعکس جب یہی گرین ہاؤس اثر ضرورت سے زیادہ شدید ہوجائے تو زمین کو خلاف معمول گرم کردیتا ہے۔ اس اثر میں اضافہ انسانوں اور نباتات وحیوانات کے لیے گوناگوں مسائل پیدا کرتا ہے، جیسا کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کیوٹو پروٹوکول، میں اس کا عہد کیا گیا تھا کہ 2012 تک گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں 5 فیصد کمی کردی جائے گی۔ مگر اس معاہدے پر امریکہ اور آسٹریلیا نے دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ ان ممالک میں آلودگی انتہا پر ہے۔ امریکہ کی آبادی دنیا کی آبادی کا 4.30 فیصد ہے جب کہ اس کے گیس، کوئلہ، پٹرول اور ایندھن کا حصہ 35 فیصد ہے۔ امریکہ فی الحال 28 فیصد ماحولیاتی آلودگی کا سبب ہے۔ اس کے برعکس ایشیا کی آبادی دنیا کی آبادی کا 23 فیصد ہے مگر اس کے گیس، کوئلہ، پٹرول، ایندھن وغیرہ کا حصہ 3 فیصد سے بھی کم بتایا جاتا ہے۔ یہاں یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ ماحولیاتی آلودگی اگر امریکہ یا دیگر کسی ملک میں ہے تو ہمارا کیا نقصان ہوگا، نہیں بلکہ یہ عمل عالم گیر ہوتا ہے یعنی کسی بھی ملک میں ماحولیاتی بگاڑ کا اثر دور دراز کے ملک کے ماحولیاتی توازن پر پڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1992 کی ارتھ سمٹ میں دنیا کے قدرتی حیاتیاتی تنوع کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرائے گئے تھے کہ اس میں سب کی یکساں ذمے داری ہے۔

بدلتے ہوئے ماحولیاتی نظام کے جو اثرات ہماری زندگی پر پڑ سکتے ہیں، ان کے حوالے سے ہالی وڈ میں ایک فلم بنائی گئی ہے جس کا نام The Day After Tommorow (آنے والا کل) ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عالمی سطح پر ماحولیات اور موسموں کے مزاج میں جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں ان سے لوگوں کو واقف کرایا جائے تاکہ وہ اپنی سطح سے ماحولیاتی بگاڑ کو روکنے کی کوشش کریں۔

گلوبل وارمنگ میں کمی لانے کے لیے ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر کچھ کرسکتا ہے، مثلاً:

1. بجلی یا کار کا استعمال آج کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس سے گریز ممکن نہیں مگر اس کے مناسب استعمال کی طرف توجہ درکار ہے۔ مثلاً کار پولنگ (Car Pooling) کی عادت ڈالنی چاہیے یعنی ایک ہی دفتر یا قریب کے دفاتر میں کام کرنے والے لوگوں کی رہائش اگر آس پاس ہے تو بجائے اس کے کہ ہر آدمی اپنی اپنی کار سے دفتر جائے۔ چار پانچ افراد کار کا مشترکہ استعمال کرسکتے ہیں۔ سی این جی سے چلنے والی گاڑیوں کا استعمال کریں تاکہ ماحول میں دھوئیں کی آلودگی نہ پھیلے۔

2. بجلی کا استعمال ضرورت کے مطابق کریں۔ بلا ضرورت بجلی کی چیزوں کو آن نہ رکھیں۔ اس سے گرین ہاؤس گیسوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

3. شجرکاری سے گرین ہاؤس گیس میں کمی آتی ہے کیوں کہ درخت کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) جو ایک گرین ہاؤس گیس ہے اسے جذب کرتے ہیں۔

4. بوتل، ڈبے، پلاسٹک تھیلیاں اور اخبار وغیرہ کو دوبارہ قابل استعمال بنائیں کہ اس سے کوڑا کرکٹ والی جگہوں میں کمی آتی ہے جہاں سے میتھین نام کی گرین ہاؤس گیس خارج ہوتی ہے۔ آج کل بازار میں قابل تجدید اشیا ملتی ہیں جن کے پیکٹ پر ایک دائرہ کو مکمل کرتے ہوئے تین تیروں کا نشان ہوتا ہے۔ یہ اشیا استعمال شدہ چیزوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کو بنانے میں نسبتاً کم توانائی خرچ ہوتی ہے۔

5. ایسی چیزوں کا استعمال کریں جن کو چلانے میں توانائی کم خرچ ہوتی ہے۔ ایسی چیزوں میں انرجی اسٹار لیبل ہوتا ہے جن میں ٹی وی، کمپیوٹر، وی سی آر/ ڈی وی ڈی اور اسٹیریو وغیرہ شامل ہیں۔ انرجی اسٹار والی اشیا کا استعمال ماحول کے تحفظ میں معاون ہے۔

6. پروفیسر پاؤل کرٹزن جنھیں اوزون سطح میں سوراخ پر کام کرنے کے لیے 1995 میں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا، انھوں نے گلوبل وارمنگ کے اثرات کو کم کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ بالائی فضا میں سلفر کے ذرات سلفر ڈائی آکسائڈ چھوڑے جائیں جو سورج کی شعاعوں کو منعکس کریں گے جس سے حرارت واپس فضا میں چلی جائے گی۔

7. ماحولیات کے متعلق آگہی ضروری ہے۔ اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں جن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اپنے افراد خانہ اور احباب سے گلوبل وارمنگ کے مسئلے پر گفتگو کریں اور معلومات کا آپس میں تبادلہ کریں۔ □□□

پتہ:
401, Basera Apartment, F-41, Nafees Road,
Batla House, New Delhi-110025

صباح الدین احمد

مطالعۂ زبان اور کمپیوٹر

لسانیات زبان کے سائنسی مطالعے کا علم ہے۔ توضیحی لسانیات زبان کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتی ہے: زبان کی پہلی سطح جس میں زبان کی صوتی اور امتیازی آوازوں کی اکائیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے فونیمیات کہلاتی ہے۔ زبان کی سب سے چھوٹی اکائی کو فونیم کہتے ہیں۔ فونیم کیسے یکجا ہو کر لفظ کی تشکیل کرتے ہیں اس مطالعے کو مارفولوجی کہتے ہیں۔ تیسری سطح میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ الفاظ جملوں کی تشکیل کیسے کرتے ہیں، اسے زبان کا نحوی مطالعہ کہتے ہیں۔ الفاظ اور جملے معنی کی ترسیل کیسے کرتے ہیں، اس کا مطالعہ معنیات کرتی ہے۔ زبان کے توضیحی مطالعے کا اطلاق ہم اسلوبیات، تدریس زبان، ترجمہ نگاری اور لغت نویسی میں کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر مطالعہ زبان کی مشق میں بہت کار آمد ثابت ہو رہا ہے۔ اس مضمون میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کمپیوٹر مطالعہ زبان میں کس قدر کام آتا ہے۔

کمپیوٹیشنل لسانیات:

کمپیوٹیشنل لسانیات، لسانیات کی ایک ذیلی شاخ ہے جس میں زبان کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کے لیے کمپیوٹر سے مدد لی جاتی ہے۔ کمپیوٹیشنل متن (Computational Corpus) جو مشین کے پڑھنے کی شکل (Machine readable form) میں کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے مندرجۂ ذیل تجزیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کارآمد ثابت ہوا ہے:

(۱) کمپیوٹیشنل تعمیر متن: کمپیوٹیشنل متن ایک ایسے متن کی تعمیر کرتا ہے جسے زبان کا نمونہ کہا جا سکتا ہے، جس میں مختلف علوم کے متن کے نمونے کو مختلف کاپیوں (Files) میں یکجا کیا جاتا ہے۔ زبانی زبان (Spoken language) بھی کمپیوٹیشنل متن کا حصہ ہوتی ہے۔ انگریزی میں British National Corpus (BNC) 100 لاکھ الفاظ پر مشتمل کمپیوٹیشنل متن ہے جس کے 4124 حصے زبانی زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باقی حصوں میں مختلف علوم سے متعلق متن کو یکجا کیا گیا ہے۔

(۲) الفاظ کا صرفی و نحوی تجزیہ: کمپیوٹیشنل متن کے الفاظ خود ساخت ترکیب صرفی (Automatic grammatical tagging) کی مدد سے اپنے اجزائے کلام (Parts of speech) کی وضاحت کرنے لگتے ہیں۔ جافری لیچ نے Constituent Livelihood Automatic Word-tagging System (Claws) کے ذریعہ انگریزی زبان کے صرفی مطالعے کو آسان کر دیا ہے۔

(۳) الفاظ شماری: کمپیوٹیشنل متن سے الفاظ کے تواتر کی تفصیل، الفاظ شماری کے ذریعہ پیش کی جاتی ہے۔ الفاظ کے تواتر کی تفصیل تعداد کے لحاظ سے اوپر چڑھتی (Ascending) اور نیچے گرتی (descending) ہوئی ترتیب آسانی کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب حروف تہجی (Alphabetical Order) کے مطابق بھی پیش کی جاتی ہے۔ کمپیوٹیشنل مواد کے کچھ حصے کی یا پورے متن کے الفاظ کی ترتیب تعداد کے لحاظ سے یا حروف تہجی کی ترتیب (Dictionary order) کے مطابق کی جا سکتی ہے۔

(۴) الفاظ کا سیاق (Concordance): الفاظ کے سیاق و سباق کے ذریعہ کسی متن میں کوئی ایک لفظ کن کن سیاق و سباق میں استعمال ہوا ہے اس کی مکمل تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ انگریزی زبان کے مطالعے کے لیے (Kwic) Key word-in-contex کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس سافٹ ویر کے ذریعے چارلس ڈیکنز کے ایک ناول 'A tale of two cities' میں 'غریب' لفظ کا استعمال کن سیاق و سباق میں ہوا ہے اس کی تصویر کچھ اس طرح ہوگی۔

taste it is that such	Poor	cattle always have in their mouths
of sparing the	Poor	child the inheritance of any part of
small property of my	Poor	father, whom I never saw-so long
desoate, while your	Poor	heart pined away, weep for it
Miss, if the	Poor	Lady had suffered so intensely
the love of my	Poor	mother hid his torture from me
stockings, and all his	Poor	tatters of clothes, had, in a long
faded away into a	Poor	weak stain. So sunken and
on yur way to the	Poor	wronged gentleman, and, with a
detachment from the	Poor	Young Lady, by Lying a brawny hand

اس سافٹ ویر کی مدد سے انگریزی میں کئی مصنفوں کی لفظیات کا کنکارڈینس تیار ہو چکا ہے، ان میں شیکسپیر کی کنکارڈینس بہت مشہور ہے۔

(۵) الفاظ کا جال (Word Net): جارج میلر الفاظ کے جال کے بانی ہیں، الفاظ کا جال لفظوں کو ان کے معنیاتی عمودی درجہ بندی (Semantic hierarchies) کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ الفاظ کے جال میں مختلف الفاظ کے رشتوں کی وضاحت ملتی ہے مثلاً: مترادفات (Synonyms)، Hypernyms، Holonyms، Meronyms، متضاد (Antonyms) وغیرہ۔

کمپیوٹیشنل متن کا استعمال اب زبان کے صرفی، نحوی و معنیاتی مطالعے میں کارآمد ثابت ہو رہا ہے، اس کے علاوہ تاریخی لسانیات، سماجی لسانیات، عمرانیات، تدریس زبان، مشینی ترجمہ، اسلوبیاتی مطالعہ و تدوین لغت میں بھی کمپیوٹیشنل متن کا استعمال ہو رہا ہے۔

ہندوستانی زبانوں میں کمپیوٹیشنل متن کی تعمیر کی ابتدا Technological Development in Indian Language (TDIL) کے ذریعہ ہوئی۔ مختلف شیڈول زبانوں میں کمپیوٹیشنل متن تیار کیا گیا۔ اردو میں تیس لاکھ الفاظ پر مشتمل کمپیوٹیشنل مواد تیار کیا جا چکا ہے۔ اردو کمپیوٹیشنل متن کے مطالعہ کے لیے Software بھی تیار ہوئے ہیں مثلاً: خود ساخت ترکیب صرفی (Automatic parsing) اور الفاظ تعداد شماری۔ اردو میں کمپیوٹیشنل متن اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے۔

تدریس زبان اور کمپیوٹر:

کمپیوٹیشنل متن کا بڑا حصہ تقریری زبان پر مشتمل ہوتا ہے۔

تدریس زبان کی روایتی کتابوں میں مصنوعی مثالیں ہوتی ہیں اور زبان کی قواعد کی توضیح ملتی ہے، جو زبان کے عام استعمال کے لیے بہت مفید ثابت نہیں ہوتی ہے۔ کمپیوٹیشنل متن کی مدد سے مرتب کردہ کتابوں میں زبان کے عام روزمرہ استعمال کی مثالیں بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ طلبہ اس زبان کو آسانی سے سیکھ جاتے ہیں جن کا استعمال روزمرہ کی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ قواعدی نقطۂ نظر سے لکھی گئی روایتی تدریسی کتابیں اس سماجی ضرورت کو پورا کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ انگریزی تدریس کی روایتی کتابوں اور کمپیوٹیشنل متن کے تقریری زبان کے تقابلی مطالعے کے ذریعہ کینیڈی (1987)، مینڈٹ (Mindt :92) اور ہومس (Holmes) نے یہ ثابت کیا ہے کہ لفظیات اور جملے کی تراکیب جو روایتی تدریسی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اس زبان سے بڑی حد تک مختلف ہوتی ہیں جو اہل زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کمپیوٹیشنل متن کے تقریری زبان کے حصے کی مدد سے مرتب کردہ کتابوں سے مبتدی کو زبان کے عام استعمال میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر معاون تدریسی کورس بھی زبان کے سیکھنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

اب درس و تدریس کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کافی مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ کمپیوٹر کی مدد سے حصول علم مفید، کارگر اور بڑی حد تک سہل ہو گیا ہے۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی خاص بات یہ ہے کہ اس عمل میں طالب علم کو کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ دوطرفہ تفاعل میں مصروف کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر کمپیوٹر طریقہ تدریس کی امدادی اشیا کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ نصاب کے اسباق اس طرح سے تیار کیے جاتے ہیں کہ تدریس کا بندوبست بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسباق کی تدریس کے ساتھ جانچ (Testing) اور مشق (Exercise) کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ یہی متن فاصلاتی تعلیم میں نشر و اشاعت کے کام بھی آتا ہے۔ کمپیوٹر، اسباق کے میوزیم کا کام کرتا ہے جس سے ہر سبق تک رسائی بہت آسانی سے ہو جاتی ہے۔

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس کے فوائد:

(۱) روایتی کلاس روم لکچر اور کتاب کے ذریعہ حصول علم میں طلبہ کی جامد (Passive) حیثیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تدریس بہ امداد کمپیوٹر طلبہ کو فعال بنا دیتا ہے۔ اس کے اسباق 'خود رہنمائی' کے اصول پر ڈیزائن کیے جاتے ہیں، جس کے ذریعہ طلبہ فعال اشتراک (Active Participation) کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ طریقہ ہر مقاصد کے حصول اور مہارتوں کو مزید تقویت دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ طالب علم کو حصول علم میں خود مختار بنا دیتا ہے۔

(۲) طلبہ کے تفاعلی اشتراک کے عمل میں کمپیوٹر فوراً فیڈ بیک دیتا ہے۔ کمپیوٹر طلبہ کے جوابات کے مطابق مختلف طریقوں یا مختلف مواد کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ فیڈ بیک اصلاحی بھی ہوتا ہے۔

(۳) کمپیوٹر کے اسباق میں ڈرل/مشق کا استعمال ہوتا ہے جو طلبہ کی خامیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے غلطی کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جاتے ہیں۔

(۴) تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے ذریعہ طلبہ کو مختلف سوالات سے کوئی بھی سوال چننے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جوابات کا ایک سلسلہ دیا جا سکتا ہے جہاں ایک جواب دوسرے سے زیادہ واضح ہوں۔ اس طرح طلبہ کو ہر انتخاب پر ایک فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔

(۵) کمپیوٹر طلبہ کی ترقی کی واضح تصویر رپورٹنگ سسٹم کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس سے طلبہ اپنی کمیوں کو جان لیتے ہیں۔

(۶) کمپیوٹر ملٹی میڈیا کا کام کرتا ہے جس میں سمعی وبصری سہولتوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ محرک تکنیکوں مثلاً چلتی پھرتی تصویروں اور خاکہ کشی کے استعمال سے تدریس کے کام کو آسان کر دیا جاتا ہے۔

(۷) تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے طلبہ میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو تقویت ملتی ہے۔

(۸) تدریس بہ امداد کمپیوٹر خود رہنمائی کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ طلبہ میں خود رہنمائی وخود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

اسلوبیاتی مطالعہ:

اسلوبیات، ادب کے لسانیاتی مطالعے کا نام ہے جس میں زبان کے ادبی وتخلیقی استعمال کا مطالعہ لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی مطالعے میں لسانیاتی تجزیے کی مدد سے کسی فن پارے کی اسلوبیاتی خصوصیات کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو اس فن پارے کی انفرادیت کا سبب ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی تجزیے کی بنیاد پر کسی فنکار کے اسلوب کا تعین کیا جاتا ہے اور ایک فنکار کے اسلوب کو دوسرے فنکار کے اسلوب سے ممیز بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسلوبیات کے عالم عموماً کسی خاص متن یا کسی خاص فنکار کی زبان کے اسلوبیاتی مطالعے میں مصروف رہے ہیں۔ کمپیوٹیشنل متن کی مدد سے اب یہ مطالعہ زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ اب ایک بڑے متن کے الفاظ کے تجزیے کے ذریعے یہ جاننا آسان ہوگیا ہے کہ کسی صنف کی عمومی زبان کیا ہے۔ مجموعی طور پر کسی صنف میں کس ساخت، تراکیب، لفظیات کا استعمال ہوا ہے۔

کسی فنکار کی زبان کی ساخت، تراکیب، لفظیات کا مطالعہ کمپیوٹیشنل متن کے ذریعہ آسان ہوگیا ہے۔ کسی فنکار کے اسلوب کی خصوصیت کا تعین اس کی زبان کے استعمال سے ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فنکار کی کیا لفظیات ہیں۔ جملوں کی تراکیب کیسی ہے اور یہ استعمال عام زبان سے یا اسی صنف کے دوسرے فنکار سے کس طرح مختلف ہے۔ فنکار کے لفظیات کی ترتیب اب کمپیوٹر کے ایک سافٹ ویر، Word frequency count الفاظ شماری کی مدد سے بہت آسان ہوگئی۔ اگر کلیات غالب کمپیوٹر میں Feed کر دیا جائے تو اس سافٹ ویر کی مدد سے ۵ منٹ میں غالب کے لفظیات کی فرہنگ آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح کسی شاعر کے دیوان/ دواوین کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کے بعد اس کے لفظیات کی مکمل تفصیل ڈکشنری کی ترتیب میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون سے الفاظ کتنی بار استعمال ہوئے ہیں۔

تدوین لغت:

لغت کسی زبان کے الفاظ کے بارے میں معلومات فراہم کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہے۔ لسانی اعتبار سے لغت کسی زبان کی صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی معلومات کا اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ کوئی لفظ کس طرح لکھا جائے، کس طرح بولا جائے، اس لفظ کے مروجہ اور قدیم معنی کیا ہیں، اس کا تعلق کس جزو کلام سے ہے، اس کی تصریفی شکلیں کون کون سی ہیں، اس کا ماخذ کیا ہے، اس کے مشتقات کیا کیا ہیں، نیز اس کے مترادفات اور متضاد الفاظ کون کون سے ہیں۔ یہ سب معلومات لغت میں پائی جاسکتی ہیں۔ الفاظ کی نوعیت کے اعتبار سے لغات کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں۔ عمومی لغات (General Dictionary) میں الفاظ کے تلفظ، معنی، ماخذ، مشتقات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ تحدیدی لغات (Restricted Distionary) علمی وپیشہ ورانہ اصطلاحات، مترادفات، مرکبات، علاقائی لفظیات، کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔

تدوین لغت میں کمپیوٹر کے استعمال نے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ کمپیوٹیشنل متن کی تعمیر میں مختلف علوم کے متن کو کمپیوٹر میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اگر ہمیں عام لغت کی تدوین کرنی ہے تو اس متن کے الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کمپیوٹر سافٹ ویر کے ذریعہ منٹوں میں کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمیں علم کیمیا کی لغت تیار کرنی ہے تو علم کیمیا سے متعلق متن کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کے بعد کمپیوٹر سافٹ ویر کی مدد سے علم کیمیا کی فرہنگ آسانی سے تیار کی جاسکتی ہے۔

لغت نگاری (Lexicography) اطلاقی لسانیات کی اہم شاخ ہے۔ لغت کا بنیادی موضوع کسی زبان کا ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے اور لغت میں ہر ایک لفظ کی ترتیب حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے، تاریخی اعتبار سے کسی بھی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، کچھ الفاظ معدوم ہوجاتے ہیں اور کچھ الفاظ کا اضافہ ہر زمانے میں ہوتا رہتا ہے۔ الفاظ کو لغت کی ترتیب میں یکجا کرنا ایک دشوار کام تھا، الفاظ کو جمع کرکے ان کے کارڈ بنائے جاتے تھے اور انھیں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ترتیب دیا جاتا تھا۔ کمپیوٹر کی مدد سے یہ کام اب بہت ہی آسان ہوگیا۔ خودکار حروف تہجی ترتیب سافٹ ویر کے ذریعہ یہ کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

لغت نگاری کا مقصد کسی زبان کے ذخیرہ الفاظ کو جامعیت کے ساتھ محفوظ کرنا اور اس پر مسلسل نظر ثانی کرنا ہے۔ کمپیوٹر کی مدد سے نظر ثانی بھی اب بہت سہل ہوگئی ہے۔

موضوع اور استعمال کے لحاظ سے انواع و اقسام کے لغات پائے جاتے ہیں:

(۱) عمومی (General) لغت: اس میں ایک زبان کے تقریباً تمام الفاظ مشتقاق کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

(۲) بولی لغت: کسی علاقے سے متعلق لغت، مثلاً "لغات گجری" یا "دکنی لغت"، کسی طبقاتی بولی کی لغت مثلاً پارسی گجراتی کی لغت، کرخنداری اردو کی لغت، "لغات النسا" وغیرہ۔

(۳) کسی علم، فن یا پیشہ کی لغت مثلاً، معیار کی لغت، کھیلوں کی لغت، ادبی اصلاحوں کی لغت۔

(۴) ایک مصنف کی لفظیات: اس میں ایک ہی مصنف کے استعمال کردہ الفاظ کی تدوین ہوتی ہے۔ مثلاً غالب، ملٹن، کبیر داس کے لفظیات کی لغت۔

اس کے علاوہ مترادفات لغت، کہاوتوں کی لغت، محاوروں کی لغت مندرجہ بالا تمام لغت کی تدوین میں کمپیوٹر کارآمد ہوتا ہے۔ زبان کے توضیحی مطالعے کے اطلاق سے تدریس زبان، اسلوبیات اور تدوین لغت میں کمپیوٹر بہت کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر کا استعمال مطالعہ زبان کی مشق کے لئے بھی کارگر ثابت ہوا ہے۔ کمپیوٹر تقیر متن سے زبان کا توضیحی مطالعہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر نے اس طرح تدریس زبان، اسلوبیات اور تدوین لغت میں بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

کتابیات:

- Grisman, Ralph (1986) Computational Linguistics: An introduction Cambridge University Studies in Natural Language Processing. Cambridge University Press: Cambridge.
- King, Margaret ed. (1983) Parsing Natural Language. Academic Press/ Harcourt Brace Jananovich : London.

□□□

پتہ:

Deptt. of Lisaniyat,
Aligarh Muslim University, Aligarh

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ "اسلوبیات" کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام "نشاطِ روح" (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے "تبصرہ" کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

سیّد محمد محسن

(ہماری مطبوعات سے)

محرکات کی اصناف بندی

محرکات کو اجمالی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔(1) عضویاتی اور (2) نفسیاتی۔ عضویاتی محرکات کو حیاتیاتی محرکات بھی کہتے ہیں۔ نفسیاتی محرکات کو سماجی محرکات کہا جاتا ہے۔

بھوک، پیاس، ہوا کی ضرورت، عمل، آرام اور جنس کے محرکات حیاتیاتی یا عضویاتی محرکات ہیں۔ انہیں حیاتیاتی یا عضویاتی محرکات اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عضویاتی حاجتوں کی تسکین سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں حیاتیاتی اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ بغیر ان کی تسکین کے زندگی ممکن نہیں ہے البتہ جنسی محرک اس سے مستثنیٰ ہے۔ جنسی محرک کی تسکین کے بغیر زندگی ممکن ہے لیکن جنسی محرک بھی حیاتیاتی محرک ہے کیونکہ اس سے ایک اہم حیاتیاتی حاجت کی فراہمی ہوتی ہے یعنی بقائے نسل، کسی نئے جاندار کی پیدائش جنسی محرک کی تسکین ہی پر منحصر ہوتی ہے۔ جنسی عمل کے بغیر افزائش نسل نہیں ہوسکتی۔

سب سے پہلے ہم بھوک کے محرک پر غور کریں۔ جسم کو روغن، لحمیہ، کاربوہائیڈریٹ، حیاتین اور کچھ معدنیات مثلاً لوہا، نمک وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں جسم کے لیے ان غذاؤں سے مہیا ہوتی ہیں جنھیں ہم کھاتے ہیں۔ یہ سب جسم کے خلیوں کی تعمیر اور جسم کے ذریعہ انجام دیے گئے افعال میں کام آتی ہیں۔ استعمال ہو جانے کے بعد فضلات کی شکل میں یہ جسم سے خارج ہو جاتی ہیں پاخانے اور پیشاب میں یہی فضلات ہوتے ہیں۔ جسم سے فضلات کا اخراج بھی عضویاتی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ جسم میں ان چیزوں کی کمی پورا کرنے کے لیے ان کی تازہ رسد کی ضرورت ہوتی ہے بھوک کا محرک اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جب کھانا کھالیا جاتا ہے تو جسم کی حاجت فی الوقت پوری ہو جاتی ہے۔ بھوک کا محرک ایک حیاتیاتی محرک ہے کیونکہ جسم کو جو چیزیں غذا کے ذریعہ ملتی ہیں وہ صرف جسم کے افعال ہی کے لیے ضروری نہیں ہوتیں بلکہ وہ صحت اور جسم کی زندگی کے لیے بھی ضروری ہوتی ہیں۔ کوئی بھی بھوک ہڑتال غیر معینہ مدت تک قایم نہیں رہ سکتی۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جو غذا کے لیے مکمل بے رغبتی پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسی بیماریوں میں مبتلا مریض زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

پیاس کا محرک بھی ایک عضویاتی یا حیاتیاتی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جسم کو رطوبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی پی کر ہم جسم کی رطوبت کی مہیا کر لیتے ہیں، پسینہ اور پیشاب جسم سے رطوبت کو نکال دیتے ہیں۔ رطوبت کی کمی کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پیاس کا محرک اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔ پانی یا کوئی دوسرا مشروب پینے سے اس محرک کی تسکین ہو جاتی ہے۔ غذا کی طرح پانی بھی زندگی اور صحت کے لیے ضروری ہے۔ جب کسی شخص کو سہل آنے لگتے ہیں تو اسے بار بار پتلی اجابت ہوتی ہے۔ اس صورت میں جتنی رطوبت جسم کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اور جسے ہم پانی پی کر پوری کر لیتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ جلد خارج ہو جاتی ہے۔ اس سے جو حالت پیدا ہوتی ہے اسے اقل رطوبت کہتے ہیں۔ جس کا مطلب جسم میں رطوبت کی کمی کا ہوتا ہے۔

ہوا کی ضرورت بھی ایک عضویاتی یا حیاتیاتی محرک ہے۔ جسم کو آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے جو ہوا میں موجود رہتا ہے۔ آکسیجن جلاتا ہے۔ خون میں شکر ہوتی ہے جو غذا کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور جگر میں جمع رہتی ہے۔ جس ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ خون کو آکسیجن مہیا کرتی ہے۔ دوران خون کے ذریعہ خون میں موجود شکر اور آکسیجن دونوں عضلات میں پہنچ جاتے ہیں۔ آکسیجن شکر کو جلاتا ہے۔ شکر کے جلنے سے وہ توانائی پیدا ہوتی ہے جس کا عضلات میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح خون میں ملی شکر کی طرح آکسیجن بھی جسم کے افعال کے لیے ضروری ہے۔

سانس لینے کا عمل جسم کے لیے آکسیجن کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ زیادہ بلندی پر ہوا میں کافی آکسیجن نہیں رہتا۔ جسم میں آکسیجن کی فراہمی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے آکسیجن کی مصنوعی رسد اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ غوطہ خوروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب وہ سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی یا فقدان سے جو حالت پیدا ہوتی ہے اس سے دم گھٹنے لگتا ہے اگر اس کے لیے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی تو یہ حالت

"ابتدائی نفسیات" سے ماخوذ از سیّد محمد محسن، مترجم: محمد رضوان احمد خاں، صفحات: 240، قیمت: 61/-

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔
ادارہ

موت کا باعث بن جاتی ہے۔

عمل اور آرام یا نیند بھی عضویاتی ضرورتیں ہیں۔ اگر جسم کا کوئی حصہ کچھ دنوں کے لیے مکمل طور پر بے حرکت بنادیا جائے تو وہ اجسام خلیہ جس سے ملکر اس حصہ کی ترکیب ہوئی ہے مردہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اشخاص جن کے ہاتھ یا پیر لمبے عرصے تک پلاسٹر میں رہتے ہیں، پلاسٹر ہٹا دینے کے بعد اس ہاتھ یا پیر کو حرکت نہیں دے سکتے۔ ہاتھ یا پیر کی بے حرکتی انہیں کمزور کر دیتی ہے اور بعض اوقات مکمل طور پر بے حرکت اور بیکار بنا دیتی ہے۔ کسی شخص کی حرکتوں کو زیادہ دنوں تک مکمل طور پر روک دینے سے زیادہ سخت کوئی سزا نہیں ہوسکتی۔ اس سے اس شخص کی حاجتِ عمل کے راستے بند ہو جاتے ہیں جس سے پیدا شدہ حاجتی تناؤ اس کے اندر سخت بے چینی پیدا کرتا ہے۔ آپ کسی تندرست شخص کو شدید تکلیف دیے بغیر، نیند کی حالت کے سوا، صاحبِ فراش رہنے کے لیے آمادہ نہیں کر سکتے۔ بچوں میں حاجتِ عمل بہت قوی ہوتی ہے۔ ان کی یہ حاجت اگر بزرگوں کے ذریعہ خاطر خواہ سمت میں نہیں موڑ دی جاتی تو اپنا راستہ خود اختیار کر لیتی ہے۔

نیند کی ضرورت، عمل کی ضرورت کی ضد ہے۔ ایک جاندار اپنی توانائی کا استعمال ان افعال کی انجام دہی میں کرتا ہے جو بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں اس استعمال شدہ توانائی کی بحالی کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیند یہ موقع فراہم کرتی ہے۔ گہری نیند سے جاگنے پر انسان خود کو تازہ دم اور توانا محسوس کرتا ہے۔ صحت کے لیے نیند ضروری ہے، بے خوابی کی مسلسل حالت جسم کو تھکا دیتی ہے۔ نیند کے بغیر انسان نہ صرف جسمانی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی علیل ہو جاتا ہے۔ مسلسل بے خوابی سے ذہنی بیماری پیدا ہوتی ہے۔

جنس ایک نہایت قوی عضویاتی محرک ہے۔ ہمارے جنسی غدود جنسی ہارمون خارج کرتے رہتے ہیں۔ غدودی اخراج اور ہارمون سے متعلق معلومات ہم پہلے حاصل کر چکے ہیں۔ جنسی ہارمون جمع ہو کر جنسی محرک کو بیدار کرتے ہیں۔ جمع شدہ رطوبت جنسی عمل کے ذریعہ خارج ہو جاتی ہے۔ چھوٹے جانوروں میں جنسی عمل مقررہ وقفے سے رونما ہوتا ہے۔ انسان میں جنسی محرک صرف عضویاتی ضرورت ہی نہیں بلکہ ایک اہم نفسیاتی اور سماجی محرک بن چکا ہے جنسی محرک کو ابھارنے میں تصورات اور احساسات جنسی غدود کے اخراج رطوبت سے پیدا ہونے والی عضویاتی حالتوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دوسرے عضویاتی محرکات کے برخلاف جنسی محرک کو اپنی تسکین کے لیے فطری بالیدگی اور نشو نما کا ایک طویل مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ تحلیل نفسی کے موجد اور عظیم ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے پیدائش کے وقت سے لے کر بلوغت کے حصول تک جنسی محرک کی نشو نما میں متعدد منزلوں کی نشاندہی کی ہے۔ نشو و نما کا یہ طویل مرحلہ صرف جسم کے ان اعضا کی بالیدگی کی طویل مدت کا نتیجہ نہیں ہوتا جو ایام بلوغت کے جنسی افعال میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ ان سماجی اور نفسیاتی عوامل سے بھی متاثر ہوتا ہے جو کامل شخصیت کی نشو نما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جنسی نشو و نما کو فرائڈ نے نفسی جنسیاتی نشو نما کہا ہے۔

مذکورہ بالا محرکات کو نفسیاتی یا سماجی محرکات سے تمیز کرنے کے لیے بنیادی محرکات بھی کہا جاتا ہے۔ سماجی یا نفسیاتی محرکات کو اکتسابی محرکات کہتے ہیں۔ بنیادی محرکات انسانی یا غیر انسانی سبھی جانداروں میں کسی نہ کسی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ جسم کی صحت اور زندگی کے لیے ان کا وجود ضروری ہے۔ ان سے جسم کی بنیادی عضویاتی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ یہ پیدائشی یا خلقی ہوتے ہیں۔ سماجی محرکات کی طرح یہ اکتسابی نہیں ہوتے۔ سماجی محرکات کا اکتساب دوسرے اکتسابی افعال کی طرح کیا جاتا ہے۔ ان کا اکتساب عضویاتی ضرورتوں کی تسکین کے دوران ہوتا ہے۔

اگرچہ بنیادی محرکات کا اکتساب نہیں کیا جاتا اور یہ جسم کی عضویاتی یا نسیجی ضرورتوں کے تحت پیدا ہوئے ہیں، پھر بھی جہاں تک انسان کا تعلق ہے ان کی تسکین کا طریقہ بڑی حد تک اکتسابی ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبوں میں بھوک کے محرک کی تسکین مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ کھانے کی چیزوں کے لیے ہماری پسند اور ناپسند کی نشو و نما سماجی ماحول کے ان حالات کے تحت ہوتی ہے جو ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کھانے کی چیزوں کے علاوہ ایک بچہ کھانے کا طریقہ بھی سماجی اثر کے تحت ہی سیکھتا ہے۔ عام ہندوستانی چھری کانٹے کے بغیر کھا لیتا ہے۔ مگر ایک عام انگریز بغیر چھری کانٹے کے نہیں کھا سکتا۔ یہ بات دوسرے بنیادی محرکات پر بھی صادق ہوتی ہے۔ جنسی محرکات اس کا مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں جنسی ضرورت کی تسکین کا مرحلہ مختلف رسم و رواج سے وابستہ ہوتا ہے۔ بعض سوسائٹیوں میں ایک شخص کا ازدواجی تعلق ایک ہی عورت کے ساتھ محدود رہتا ہے۔ دوسری سوسائٹی میں ایک شخص ایک سے زیادہ بیوی رکھ سکتا ہے۔ بعض سوسائٹیوں میں ازدواجی حدود سے باہر بھی جنسی تعلق کی اجازت ہے۔ بعض تہذیبوں میں ایک ہی عورت تمام بھائیوں کی مشترکہ زوجیت میں ہوتی ہے۔

انسان کی نفسیاتی اور سماجی ضرورتیں بے شمار ہیں۔ استوار عادات، شدید جذبات، پسندیدہ اشیا، اشخاص، حالات، نظریات وغیرہ انسان کے کردار کو داخلی طور پر بڑی حد تک اسی طرح متاثر کرتی ہیں جس طرح عضویاتی ضرورتیں یہ بالکل بنیادی محرکات ہی کی طرح اس کے کردار پر قابو رکھتی ہیں اور اس کی سمت متعین۔ بعض اوقات وہ عضویاتی ضرورتوں سے قوی تر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی سماجی یا سیاسی مقصد کے حصول کے لیے بھوک ہڑتال کرتا ہے۔

ذیل میں انسان کی بعض بہت ہی عام سماجی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تعلق پیدا کرنے کی حاجت ایک سماجی ضرورت ہے جسے ضرورتِ الحاق بھی کہتے ہیں۔ ہر فرد دوسرے اشخاص کی رفاقت کا خواہاں رہتا ہے۔ ہر شخص کو محبت اور پیار دینے اور لینے کے لیے دوستوں کی تلاش رہتی ہے۔ سماج سے کنارہ کشی، اعزہ واقربا سے علاحدگی ایک بڑی کمی کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اگر اس کمی کو دور نہیں کیا جائے تو یہ بے لطفی اور بعض اوقات انتہائی کبیدہ خاطری کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

ضرورتِ الحاق کا دوسرے شخص پر انحصار کی ضرورت سے قریبی تعلق ہے۔ یہ ضرورت بچوں میں بہت قوی ہوتی ہے۔ بالغوں میں آزادی کی ضرورت انحصار کی ضرورت کی ضد ہوتی ہے۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے وہ دوسرے اشخاص پر کم سے کم اور اپنے آپ پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کچھ ایسی ہے کہ کوئی شخص دوسروں سے مکمل طور پر بے نیاز رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان ایک سماجی جانور ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کے ساتھ صرف رفاقت کے لیے ہی رشتہ قائم نہیں کرتا بلکہ باہمی انحصار کے لیے بھی اسے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ہم جسے سوسائٹی کہتے ہیں وہ ایک دوسرے پر منحصر افراد کی ایک جماعت ہے۔ اگر کوئی کسی ایسے شخص کو نہیں پاتا جس پر وہ انحصار کر سکے تو اسے سماجی عدم تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بات اس کے لیے بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ازدواجی زندگی کسی فرد کی محض جنسی ضرورت ہی کی تسکین نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل رفیق مہیا کر کے یہ اس کی الحاقی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ زن وشو کے باہمی انحصار کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تاہم ایک بالغ شخص کی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک اپنی آزادی کو بروئے کار لانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ آزادی اور انحصار کے درمیان ایک صحت مند توازن ہی خوشگوار ازدواجی زندگی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اگر ہر ایک اپنی آزادی کو بروئے کار لانے کے قوی محرک سے مغلوب ہو جائے اور انحصار کی ضرورت کو کسی دوسری صورت میں مطمئن کرنے کی کوشش کرے تو اس کا نتیجہ باہمی تصادم ہوگا۔ اس وقت ازدواجی زندگی باہمی ناخوشگواری اور مصیبت کی کہانی بن جائے گی۔

اپنی قدر شناسی اور رتبے کی طلب بھی ایک اہم سماجی احتیاج ہے۔ ہر شخص سوسائٹی میں اپنا ایک مقام رکھنے کے قوی محرک کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اپنی قدر اور قابلیت کو تسلیم کرانے کا سنجیدگی سے خواہشمند ہوتا ہے۔ ہر سوسائٹی میں لوگ اونچے اور نیچے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جو لوگ نیچے عہدے پر ہیں اونچے عہدے کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی مادی نفع مثلاً روپے یا جسمانی آرام نہ ملے پھر بھی وہ ایسا کریں گے۔ لوگ صنعت وحرفت کے کام پر دفتر کے کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ ایک شخص ٹیلیفون، موٹر یا ایک نفیس چمنی رکھنا صرف اس لیے پسند نہیں کرتا کہ اس سے اسے فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ اس کے رتبے کو بڑھاتے ہیں اور اسی لیے وہ انھیں قابل قدر سمجھتا ہے۔ یہ اس کی عزت ووقار میں افزایش کرتے ہیں۔

طاقت یا اقتدار کی حاجت ایک دوسرا اہم سماجی محرک ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ طاقت رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ دوسروں پر اثر انداز ہو سکے۔ بعض اشخاص اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طاقت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے لیے طاقت بذات خود ایک مقصود کی حیثیت سے قابل توجہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے اقتدار کا استعمال اپنی عضویاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نہ کریں پھر بھی یہ ان کے لیے ایک گرانقدر حیثیت رکھتا ہے۔ زیادہ تر سیاسی رہنماؤں کی سرگرمیاں طاقت ہی کے محرک کی تابع ہوتی ہیں۔ دوسرے اشخاص پر لطف وکرم کرنے یا انھیں نقصان پہنچانے کا اہل ہونے میں انھیں خصوصی تسکین ہوتی ہے۔ دفتر میں "باس" بھی طاقت کی شدید ضرورت سے متاثر رہتا ہے۔ اپنے تابعین کے تئیں اس کا کردار اسی احتیاج کا آئینہ دار ہے۔ اسے اس بات کی فکر کم ہوتی ہے کہ اس کے دفتر کے لوگ کتنی لیاقت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اسے اس میں زیادہ دلچسپی ہے کہ وہ لوگ اس کے احکام کی بجا آوری کر رہے ہیں۔

□□□

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت:-/300 روپے

محمد شمس الحق (ہماری مطبوعات سے)

غذا کا جال (Food Web)

''حیوانات اور غذائی سلسلے'' (Food Chain)

پوری زمین پر ایک جیسا قدرتی ماحول نہ ملنے کی وجہ سے نہ ایک سے حیوان پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ایک سے پیڑ پودے ہی اُگا کرتے ہیں۔ پھر پانی اور خشکی کی جانداروں میں بھی، آب و ہوا کے مختلف عناصر کے فرق کی وجہ سے، یکسانیت نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی بہت سی نسلیں ہوگئی ہیں۔

حیوانوں کے کئی درجے کیے جاسکتے ہیں۔ غذا کو ذہن میں رکھ کر اگر ان کی درجہ بندی کی جائے تو ان میں ایک درجہ سبزی خوروں کا ہوگا جو شمسی توانائی سے یا شعاعی ترکیب (Photosynthesis) سے پیدا شدہ پیڑ پودوں کو اپنی غذا بناتا ہے۔ بھیڑ، بکری، گائے، گھوڑا، خرگوش، زراف، زیبرا وغیرہ حیوانات سبزی خوروں کے درجے میں آتے ہیں ان کو قدرت کا صارف اول کہا گیا ہے۔ جو حیوانات دوسرے حیوانوں کو اپنی غذا بناتے ہیں، وہ دوسرے درجے کے صارف (یا ثانوی صارف) ہوئے۔ ان کو گوشت خوروں کے درجے میں رکھیں گے۔ شیر، شیر ببر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ جنگلی جانور اسی درجے کے ہیں۔ آدمی جو اشرف المخلوقات ہے، اسے کس درجے میں رکھا جائے؟

جس طرح دوسرے حیوانات اپنے ماحول کے مطابق زندگی گذارتے ہیں، ویسے ہی انسان بھی اپنے ماحول کا غلام ہے۔ ضرورتوں اور حالات کے مطابق وہ سبزی خور بھی ہے اور گوشت خور بھی۔ زمین پر ایسے بھی جاندار ہیں جو سڑے گلے پیڑ پودوں اور مردہ جانوروں کو اپنی غذا بناتے ہیں، جیسے ـــــ بیکٹیریا، دیمک، پھپھوندی (Fungus) وغیرہ۔ اس طرح قدرت میں غذائی سلسلوں کا ایک پیچیدہ جال بنا ہوا ہے۔ غذا اور غذائی اشیا سے جانداروں کو توانائی اور پرورش کرنے والے اجزا حاصل ہوتے ہیں۔

جانداروں (حیوانات) کا وہ درجہ جو اپنی غذا یا اشیائے خوردنی کے لیے مناسب د موافق پودوں پر منحصر ہے اول درجہ کا صارف کہلاتا ہے۔ پودے مناسب مٹی اور آب و ہوا پا کر اگتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ حیوانوں کا دوسرا درجہ جو اپنی غذا کے لیے دوسرے جانداروں پر منحصر ہے تیسرے درجہ کا صارف کہلاتا ہے۔

مٹی، پانی اور آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے جانداروں کی مختلف نسلوں کا ملنا فطری امر ہے۔ زیادہ تر جاندار خشکی پر ملتے ہیں، لیکن آبی جانداروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ خشکی کے جانداروں میں ہاتھی جیسے قوی الجثہ جانور موجود ہیں، تو چھپکلی، مکھی، مچھر اور کیڑے مکوڑے جیسے چھوٹے جاندار بھی ملتے ہیں۔ آبی جانداروں میں چھوٹی مچھلیوں سے لے کر بڑی مچھلی اور وہیل تک آتے ہیں۔ سب کے سب کھاتے پیتے اور افزائش نسل کرتے ہیں۔ ان سب کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اشرف المخلوقات انسان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس نے قدرتی ماحول سے مطابقت ہی نہیں بلکہ اسے بھی اپنے موافق بنا لیا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً 6 ارب ہے۔ لہٰذا حصول غذا کے لیے اسے نئے نئے متبادل پر غور کرنا پڑ رہا ہے۔

غذائی اجزا سے توانائی کی منتقلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جانداروں کی نسل اور ماحولیاتی حالات کے مطابق توانائی حاصل کرنے کی رفتار میں یکسانیت نہیں رہتی ہے لہٰذا کتنے ہی جاندار فنا ہو جاتے ہیں۔ جانداروں کی ماحولیاتی صلاحیت کی وجہ سے بھی موت ہوا کرتی ہے۔

خشکی کے اور پانی کے ذخیروں کے حالات مختلف ہیں۔ ان کے حالات میں فرق کی وجہ سورج کی روشنی کا اندر تک نہ پہنچ پانا ہے۔ اس وجہ سے سمندروں کی گہرائیوں میں غذائی اشیا کی پرورش نہیں ہو پاتی اور زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی روشنی تقریباً 30 میٹر تک پہنچ پاتی ہے۔ اوپری حصوں میں آکسیجن زیادہ اور بھرپور رہنے کی وجہ سے پرورش کرنے والے مادے زیادہ رہتے ہیں۔

زیادہ تر پیڑ پودے خشکی پر اُگتے ہیں۔ ان کی تقسیم اور ان کا پھیلاؤ خشکی کی بناوٹ، شکل اور آب و ہوا کے حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ نباتات کے علیحدہ علیحدہ جھنڈ (یا جماعت) کو الگ الگ نام دیے گئے ہیں۔ جنگل، جھاڑی گھاس، کائی اور ٹنڈرا وغیرہ۔ ان پر انحصار کرنے والے حیوانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔

اسی کرۂ حیات میں پرندوں کی بھی دنیا آباد ہے۔ پرندے اپنی مختلف

"ماحولیات" سے ماخوذ از محمد شمس الحق، صفحات 342، قیمت : -/120

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ضروریات کی تکمیل کے لیے نباتات اور حیوانات دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے حیوانات کی طرح موافق ماحول کی تلاش میں ضروریات کے لحاظ سے پرندے بھی ہجرت کرتے رہتے ہیں۔ سرد خطوں سے برفباری کے دور میں گرم خطوں کی طرف۔۔۔ اور افزائش نسل کے لیے آبی ذخیروں سے خشکی کی طرف ان کی ہجرت عام ہے۔

Food Chain

غذائی سلسلہ (Food Chain) کرۂ حیات میں اجزائے ترکیبی کی ساخت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مادّوں اور توانائی کی منتقلی کو ظاہر کرنے کا اہم کام بھی انجام دیتا ہے۔ جس سے کرۂ حیات کو رفتار اور تیزی ملتی ہے۔

غذائی سلسلے ہمیشہ پیڑ پودوں (نباتات) سے شروع ہوتے ہیں۔ اسے ایک پیرامڈ (Pyramid) کی شکل میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ جسے ''غذائی پیرامڈ'' کہتے ہیں۔ غذائی پیرامڈ میں ہم جیسے جیسے قاعدہ (Base) سے راس (Top) کی طرف بڑھتے ہیں، اسکی شکل چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پیدا کرنے والے (Producer) سے جیسے جیسے ہم لوگ صارف (Consumer) کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس کی تعداد بالترتیب کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا پیدا کرنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں اور صارف بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ غذا حاصل کرنے والے حیوانات کی شکل شکار ہونے والوں سے بڑی ہوتی چلی جاتی ہے۔

غذا کا جال (Food Web)

کرۂ حیات کے ماحولیاتی نظام (Ecosystem) میں ایک ساتھ مختلف اقسام کے غذائی سلسلے (فوڈ چین) پائے جاتے ہیں۔ غذائی سلسلے ہمیشہ ایک سیدھی زنجیر کی شکل میں نہیں ہوتے، بلکہ ایک دوسرے سے آڑے ترچھے جُڑ کر ایک جال (Web) سا بناتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ایک جاندار ایک سے زائد ماخذ غذا کا استعمال کرتا ہے۔ مثال کے لیے کسی گھاس کے میدان والے ماحولیاتی نظام میں مینڈکوں کو باز (عقاب) بھی کھاتے ہیں اور سانپ بھی۔ اسی طرح گھاس کھانے والے کیڑوں کو مینڈک بھی کھاتے ہیں اور گرگٹ بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غذائی سلسلے سیدھے نہ ہوکر ایک دوسرے سے آپس میں جڑے رہتے ہیں اور ایک جال جیسی شکل بنتی ہے۔ غذائی سلسلوں کے اس جال کو ''غذائی جال (Food Web)'' کہا جاتا ہے۔ یہاں توانائی نہایت پیچیدہ ڈھنگ سے منتقل ہوتی ہے۔

توانائی کا بہاؤ (Energy Flow)

غذائی سلسلوں میں اشیائے خوردنی (یا توانائی) کا سلسلہ وار بہاؤ (منتقلی) ہوتا ہے۔ زمین تک پہنچنے والی شمسی توانائی کا تقریباً ایک فی صد ہی فوٹو سنتھیسس کے عمل میں حصہ لیتا ہے۔ جسے داخل کرنے کے بعد پودے اسے کاربوہائڈریٹ میں کیمیاوی توانائی کی شکل میں تبدیل کردیتے ہیں۔ اس کاربوہائڈریٹ کا خزانہ پودوں کے معدے میں ہوتا ہے۔ اس جمع توانائی کا کچھ حصہ عمل تنفس میں خرچ ہوتا ہے۔ اس توانائی کا استعمال نشوونما اور سیل (خلیہ) کی بناوٹ میں ہوتا ہے۔ سبزی خور جاندار پودے کھاتے ہیں اور ان کو اول سطح کا صارف کہا جاتا ہے۔ پودوں میں جمع کیمیاوی توانائی غذائی مادوں کی شکل میں اول سطح کے منتقل شدہ توانائی کا ایک حصہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عمل تنفس اور دوسرے اعمال میں کرتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ توانائی ضائع ہوتی ہے اور وہ جانداروں کے لیے بے مصرف ہوجاتی ہے۔ پودے عام طور سے توانائی کو ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس لیے ان پودوں کو "Transducer" کہتے ہیں۔ سبزی خوروں کا شکار گوشت خوروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں وہی اعمال دہرائے جاتے ہیں جو پہلی سطح کے صارف میں ہوئے تھے۔

کرۂ حیات میں توانائی کی منتقلی "Thermodynamics" کے اصول کے مطابق ہوتی ہے۔ غذائی سلسلوں میں توانائی کی منتقلی کا ''پیرامڈ'' (Pyramid) کی شکل میں گراف سے بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ جس سے پرورش کرنے والوں کی سطحوں (Nutrition Level) کی ساخت اور ترتیب بھی دکھائی جاسکتی ہے۔ پیرامڈ کا قاعدہ (Base) پیدا کرنے والوں (Producers) کی سطحوں کو دکھاتا ہے۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف بڑھتے ہیں یہ بالترتیب تنگ ہوتا جاتا ہے۔ پیرامڈ کا راس، گوشت خور جانداروں کو ظاہر کرتا ہے۔

نباتات وحیوانات کے ذریعہ غذا حاصل کرنے کا عمل (Nutrition)

سبھی جانداروں کی زندگی کے اعمال میں کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ وہ کھانا کھاتے ہیں، اسے ہضم کرتے ہیں، غذاؤں سے توانائی حاصل کرتے ہیں، اور فضلات کو جسم سے خارج کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہی اعمال (یا سرگرمیوں) سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

تمام جاندار ہر وقت کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتے ہیں۔ اس واسطے انھیں توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ توانائی ان کو غذا سے حاصل ہوتی ہے۔ مختلف اقسام کے جاندار غذا حاصل کرنے کے لیے مختلف طرح کے طریقے اپناتے ہیں۔ غذا لینے کے عمل کو تغذیہ (Nutrition) کہتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس میں جاندار غذا حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ توانائی حاصل کرسکیں۔ غذا حاصل کرنے کے خاص دو طریقے ہیں:

(الف) خود تغذی (Autotrophic) اور

(ب) دگر تغذی (Heterotrophic)۔

خود تغذی جاندار، اپنی غذا آسان چیزوں سے بناتے ہیں۔ اس طرح خود تغذی جاندار غذا کے پیدا کرنے والے (Producer) ہوتے ہیں۔ تمام سبز پودے خود تغذی ہوتے ہیں۔ یہ اپنا کھانا تیار کرنے کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ، پانی اور معدنی نمک جیسی خام چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔ سبز پودوں میں یہ کام شعاعی ترکیب (Photosynthesis) کے ذریعہ ہوتا ہے۔

دگر تغذی (Heterotrophic) میں جاندار اپنی غذا، دوسرے جانداروں سے لیتے ہیں۔ یعنی یہ اپنی غذا، دوسرے جانداروں کو کھا کر حاصل کرتے ہیں۔ سبھی جانور (اور کچھ پودے بھی) دگر تغذی ہیں۔

خود تغذی اپنا کھانا عام مادّوں اور سالموں (Atoms) سے تیار کرتے ہیں۔ زیادہ تر دگر تغذی، پیچیدہ اور سخت مادّوں کو غذا کے طور پر لیتے ہیں اور ان کو تحلیل کر کے یا توڑ کر آسان مادوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ دگر تغذی اپنی غذا دو طرح سے لیتے ہیں۔۔۔(الف) مردہ اور ناکارہ اجسام سے، اور (ب) ان جانداروں سے جن کو مار کر کھاتے ہیں۔ مردہ اور ناکارہ اجسام سے غذا حاصل کرنے والے طریقے کو (Saprophytic) کہتے ہیں۔ ایک گند نبات (Saprophytic) اپنی غذا سڑے گلے پتیوں، پودوں اور ناکارہ مادوں سے حاصل کرتا ہے۔ فنجائی، پھپھوندی، کُکر متّا (فطر Fungus) اور بیکٹیریا، گند نبات، ہیں۔ یہ پیچیدہ کاربنک سالموں (Atoms) کو عام مادوں میں توڑ دیتے ہیں۔ ان عام مادوں کا استعمال پودوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

غذا حاصل کرنے کے دوسرے طریقے کو طفیلی (Parasitic) کہتے ہیں۔ طفیلی وہ جاندار ہیں جو دوسرے جانداروں پر منحصر رہتے ہیں اور ان سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ جراثیم جو ملیریا پھیلاتے ہیں طفیلی کی مثال ہیں۔ انسان Holozoic ہے جو ٹھوس غذا لیتا ہے۔ ان کو چھوٹے یا بڑے ٹکڑوں کو Ingestion کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر جسم کے اندر ان کا نظام ہاضمہ چلتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے جانداروں (جیسے چوپائے اور انسان وغیرہ) میں Ingestion منہ سے ہوتا ہے۔ غذا کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دیا جاتا ہے یہ کام دانت کرتے ہیں۔ ہضم کرنے کا عمل معدہ میں ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹی آنت بھی معاون ہے۔ بڑی آنت سے فضلات کے خارج کرنے کا کام جاری رہتا ہے۔ منہ کے دانت غذا کو پیستے ہیں اور لعاب دہن میں موجود انزائم، اسٹارچ کو کیمیاوی اعمال کے ذریعہ توڑنے میں مدد کرتے ہیں۔

غذا سے توانائی (Energy) کا اخراج دو مرحلوں میں ہوتا ہے: پہلے مرحلے میں پیچیدہ سالمے، سادہ سالموں میں ٹوٹتے (Decompose) ہیں۔ دوسرے مرحلے میں غذا کے سادہ سالمے جسم کو حاصل آکسیجن لے کر Oxidation کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ، پانی اور توانائی خارج کرتے ہیں۔ اسی مرحلے میں عمل تنفس (Respiration) ہوتا ہے جس میں خالص آکسیجن آتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج ہوتا ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ غذا حاصل کرنے والے عمل (Nutrition) میں ہونے والی کیمیاوی تبدیلی سارے جانداروں میں، جیسے کھٹمل، مینڈک، شیر اور انسان، سبھوں میں یکساں طور سے ہوتی ہے۔

ماحولیات (Ecology)

لفظ Ecology یونانی الفاظ Oikos (جس سے مراد ہے جائے رہائش یا سکونت) اور Logos (جس سے مراد ہے مطالعہ) سے بنا ہے، جس کا مفہوم ہے مختلف نظامِ حیات (Organism) اور ان کے ماحول کے درمیان آپسی رشتہ۔ لہٰذا زبان کے لحاظ سے Ecology کے معنی ہیں ''حیاتیات کا ان کے گھر میں مطالعہ''

چند سائنس دانوں نے (جن میں Odum بھی شامل ہیں، بحوالہ P.D. Sharma از Elements of Ecology) ایکولوجی کو The Study of the Structure and Function of Ecosystem بتایا ہے۔ اور آسان الفاظ میں ہم۔۔۔۔۔

The Study of Structure and Function of Nature

بھی کہہ سکتے ہیں۔ R. Nagabhushanam نے ایکولوجی کو اس طرح بیان کیا ہے:

The Science of Ecology Deals with The Interrelations of Plants and Animals with Their Environment.

No Animal can live entirely isolated, every animal must have organisme within its range to serve as food, all animals are dependent directly or indirectly upon green plants and many plants are dependent upon animals, for example, some plants require pollination by insects."

ایکولوجی (ماحولیات) کی کاشتکاری میں (برائے فصل چکر، ان کو کھرپات سے نجات دینا وغیرہ)، گھاس کے میدانوں کو درست کرنے (برائے پرورش جانوران) جنگلات، حیاتیاتی سروے (Biological Survey) جراثیم کے کنٹرول، مچھلی پالن، مٹی کی حفاظت (Conservation of Soil)، حیواناتی زندگی اور پانی کی سپلائی وغیرہ میں بڑی اہمیت ہے۔

نظام ماحولیات

(Ecological System or Ecosystem)

نباتات، حیوانات اور دوسرے عضوی حیات بشمول قدرتی ماحول جن سے ان کا تال میل ہوتا ہے۔ نظام ماحولیات (Ecological System) کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک مخصوص خطے میں رہنے والی زندگیاں ایک دوسرے

سے تال میل قائم کرتی ہیں، چونکہ ان کے درمیان توانائی اور مادوں کی منتقلی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ہی یہ دوسرے قدرتی ماحول ہی کی طرح نظام ماحولیات (Ecosystem) بھی تبدیل پذیر (Dynamic) ہوتا ہے۔ قدرتی ماحول میں واقع ہونے والی کوئی بھی تبدیلی مناسب توافق (Adaptation) کے لیے ماحول تیار کرتی ہے۔

کرۂ ارض کے اس قدر وسیع نظام حیات کو سمجھنا بڑا دشوار ہے۔ لہٰذا ان کو چھوٹے چھوٹے خطوں میں Ecosystem وغیرہ میں۔) تقسیم کرکے ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اس طرح ایک نظام حیات (Ecosystem) اس قدر بھی وسیع ہوسکتا ہے۔ جیسے ایک سمندر، ریگستان اور جنگل۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ سب نظام ماحولیات وقت اور جگہ کے لحاظ سے الگ الگ ہیں۔ لیکن کام اور عمل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں، جو ایک کبھی نہ الگ ہونے والا نظام تشکیل دیتے ہیں۔

آبی نظام حیات (Aquatic Ecosystem)

آکسیجن کا ارتکاز (Concentration) اور سورج کی روشنی کا پانی کے اندر تک داخلہ اور وہاں پائی جانے والی خوراک وغیرہ آبی نظام حیات کے چند ضروری عناصر ہیں۔ شعاعی ترکیب (Photosynthesis) کا عمل وہیں تک ہوتا ہے، جہاں تک سورج کی روشنی کا گذر ہوتا ہے، یعنی تقریباً 30 میٹر گہرائی تک۔

تازے پانی کی گہری جھیل میں دو ظاہری سطح نظام حیات پائی جاتی ہے ایک اوپری سطح جو گرم ہوتی ہے اور دوسری گہرائی میں جہاں ٹھنڈک اور تاریکی پائی جاتی ہے اوپری سطح میں آکسیجن زیادہ ملتی ہے اور نچلی (گہری) سطح میں خوراک زیادہ ملتی ہے، دونوں سطحوں میں موسمی پھیر بدل سے حیات کی نشوونما برقرار رہتی ہے۔ جھیلیں آہستہ آہستہ گاد اور کچڑوں سے بھر کر دلدل (Marshes and Swamps) میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ اب یہاں بہت زیادہ پیڑ پودے، آبی پرندے اور مچھلیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہاں غذا کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے۔

دریاؤں میں مختلف اقسام کی جانداروں کی نسلیں (یا حیات) پائی جاتی ہیں۔ دریا کے نچلے حصے میں پانی کے بہاؤ کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے خوراک ملتی ہے اور زندگی کے زیادہ امکانات رہتے ہیں۔

ڈیلٹا (Estuaries) آبی نظام حیات میں سب سے زیادہ زرخیز ہوتے ہیں۔ ڈیلٹا میں تازہ پانی اور نمکین پانی کا میل ہوتا ہے۔ گہرائی کم ہونے کی وجہ سے سورج کی روشنی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ جوار بھاٹا کے ذریعہ کئی طرح کی خوراک مل جاتی ہے۔ پودوں کی زبردست باڑھ (Luxuriant Plant Growth) کی وجہ سے مچھلیوں اور پرندوں کو محفوظ مقام افزائش نسل (Safe Breeding Grounds) ملتے ہیں۔

سمندری نظام حیات (Marine Ecosystem) وسیع رقبے میں پھیلے ہونے کی وجہ سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ زمین (خشکی) کی بہ نسبت یہاں تمام سکونت مساوی طور سے پھیلی ہوئی ملتی ہے۔ یہاں سکونت کی تین سطحیں ملتی ہیں:

(1) جوار بھاٹا کے پھیلاؤ تک محدود حلقہ (Intertidal Zone)

(2) براعظمی مجھوں (Continental Shelf) تک پھیلا حلقہ، یعنی The Neritic Zone اور

(3) بحری حلقہ (The Oceanic Zone)

مندرجہ بالا تینوں حلقوں میں سب سے زیادہ زندگیوں سے بھرا حلقہ براعظمی مجھوں (Continental Shelf) والا حلقہ ہے یہاں سورج کی مناسب روشنی ملتی ہے۔ لہروں کے ذریعہ خشکی سے بہہ کر آئی خوراک بہتات سے ملتی ہے۔ یہاں سمندر کی 50 فی صد زرخیزی پائی جاتی ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ماہی گیری کے اڈے، (Fishing Ground) براعظمی مجھوں (Continental Shelves) پر ہی پائے جاتے ہیں۔

خشکی والے نظام حیات (Terrestrial Ecosystem)

خشکی سے متعلق نظام حیات کی ہم لوگوں کے لیے بڑی اہمیت ہے کیونکہ ہم خشکی کے ہی باشندے ہیں اور خشکی سے ہی اپنی ضروریات کی چیزیں، جیسے غذا، اور دوسری چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ آب و ہوا کے حالات اور جملہ خصوصیات کی وجہ سے خشکی پر مختلف قسم کے پیڑ پودے اور حیوانات پائے جاتے ہیں۔ پودے اپنی مخصوص قسم کی جماعت میں رہتے ہیں ایک قسم کی آب و ہوا میں پائے جانے والے پودے اور حیوانات دوسری آب و ہوا سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان الگ الگ نباتاتی خطوں کو Biomes کہا جاتا ہے۔

خشکی والے نظام حیات کے لیے دو لازمی عناصر ہیں۔

رطوبت (Moisture) اور درجہ حرارت۔ پانی پودوں کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ پودوں میں شعاعی ترکیب اور بیج انکور نے (Germination) کے لیے بھی پانی لازمی ہے۔ پانی کی ضرورت کے لحاظ سے پودوں کو چار درجوں میں رکھا جاسکتا ہے۔

(1) Xero Phytes، جو خشک علاقوں میں بھی رہ سکتے ہیں۔

(2) Hydrophytes وہ جو بہت زیادہ نمی برداشت کرسکتے ہیں۔

(3) Mesophytes وہ جو اوسط مقدار میں نمی پر جی سکتے ہیں۔

(4) Trophophytes جو موسم کے ساتھ کم و بیش ہوتی نمی میں قائم رہ سکتے ہیں۔

Biomes

بایوم زمین کے کسی خطے کے اندر وسیع نظام ماحولیات ہے جیسے ٹنڈرا، گھاس کے میدان، منطقہ حارہ کے جنگلات اور ریگستان وغیرہ۔ ہر ایک بایوم مخصوص شناخت والے حیوانات اور نباتات کا مسکن ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت مٹی اور آب و ہوا کی قسموں پر منحصر ہے۔

پی۔ڈی شرما نے اپنی کتاب Elements of Ecology میں Shelford اور Clements کے ذریعہ بایوم کی تعریف یوں پیش کی ہے:

Under Similar Climatic Conditions, There may Simultaneously Develop more than one communities, some reaching to climax stage, others under different stages of succession. This complex of several communities in any area, represented by an assemblage of different kinds of plants, animal etc., sharing a common climate, is called a biome."

(Elements of ecology by P.D. Sharma)

''نباتاتی خطے یا بایوم''

نمی اور درجہ حرارت کے علاوہ دوسری لازمی چیز مٹی ہے۔ مٹی پودوں کی نشوونما میں ایک واسطہ (Medium) کا کام کرتی ہے۔ مٹی کی مختلف قسموں کا پھیلاؤ، مختلف طرح کی آب و ہوا سے منسلک ہے۔ زمین کی ساخت (Relief) اور پانی کا بہاؤ (Drainage) پیڑ پودوں کی مختلف قسموں کے لیے دیگر عناصر ہیں۔ پہاڑی خطوں میں جہاں اونچائی کے لحاظ سے درجہ حرارت میں فرق واقع ہوتا ہے پیڑ پودوں کی قسمیں اونچائی (Altitude) پر منحصر ہیں۔

جنگل، گھاس کے میدان، کانٹے دار جھاڑیاں اور ٹنڈرا وغیرہ خاص نباتاتی خطے ہیں۔ جہاں خوب مرطوب آب و ہوا اور زیادہ بارش ہوتی ہے وہاں جنگل پائے جاتے ہیں۔ اوسط بارش والے خطوں میں گھاس کے میدان پائے جاتے ہیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں خشک علاقوں میں اور ٹنڈرا ٹھنڈے قطبی علاقوں میں ملتے ہیں۔

جنگلات کی دو خاص قسمیں ہیں:

(الف) سدابہار (Ever Green) اور

(ب) پت جھڑ (Deciduous)

براعظموں کے مغربی ساحل پر وسطی عرض البلاد میں رومی جنگلات (Mediterranean Forest) پائے جاتے ہیں۔ یہاں جاڑے میں اوسط بارش ہوتی ہے اور گرمیوں کا موسم خشک ہوتا ہے۔ اوک زیتون، وغیرہ خاص درخت ہیں۔ یہ سدابہار ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا حصہ بحیرہ روم کے چاروں طرف ہے۔

مخروطی جنگلات (Coniferous Forsest) سدابہار ہوتے ہیں۔ یہ یورپ، ایشیا اور شمالی امریکہ کے بلند پہاڑوں پر، اور قطبوں کے نیچے چاروں طرف پائے جاتے ہیں۔ یہاں موٹی نوکیلی پتیوں والے درخت پائے جاتے ہیں۔ ملائم لکڑیوں والے درخت جیسے پاین، سیڈار، فر، اسپروس وغیرہ یہاں کے خاص درخت ہیں۔

سدابہار جنگلوں میں سب سے اہم منطقہ حارہ کے سدابہار جنگلات ہیں۔ یہاں خوب بارش ہوتی ہے اور سالوں بھر اونچا درجہ حرارت اور زیادہ رطوبت پائی جاتی ہے۔ سالوں بھر پت جھڑ بھی ہوتی ہے اور نئے پتے بھی آتے رہتے ہیں۔ سخت لکڑیوں والے درخت جیسے مہوگنی، البونی، اور، روڈ اوڈ، کثرت سے ملتے ہیں۔

پت جھڑ جنگلات:

اس درجے میں سب سے خاص مونسون خطے کے جنگلات آتے ہیں۔ گرمی سے قبل درخت اپنے پتے جھاڑ دیتے ہیں۔ اور پھر نئے پتے آتے ہیں۔ ساگوان اس خطے کا خاص درخت ہے۔

گھاس کے میدان (Grasslands)

گھاس کی جڑیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ یہ مختلف طرح کے حالات میں زندہ رہ سکتی ہیں۔ یہ گھنے جنگلات میں درختوں کے سائے میں اور ٹنڈرا اور گرم ریگستانوں میں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ دنیا میں بڑے پیمانے پر وسیع خطے میں پھیلے گھاس کے میدان، گھنے جنگلات والے خطوں اور ریگستان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ گھاس کے میدانوں کو دو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(الف) منطقہ حارہ کے گھاس، میدان (خطے) اور،

(ب) منطقہ معتدلہ کے گھاس میدان (خطے)

گھاس کے مندرجہ بالا دونوں اقسام کے خطوں کا مفصل بیان ''قدرتی خطوں'' (Natural Regions) کے بیان کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

ریگستانی پیڑ پودے (Desert Vegetation)

انتہائی کم بارش کی وجہ سے ریگستانوں میں مسلسل پیڑ پودے نہیں ہوتے۔ یہاں وہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ملتی ہیں۔ اس خطے کے پودوں کی شاخیں موٹی ہوتی ہیں۔ کانٹوں بھری اور روغنی پتیاں نمی کو برباد ہونے سے بچاتی ہیں۔ ناگ پھنی، کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان خطوں کی سرحدوں پر ببول، اکاسیا (Acacia) کے درخت ملتے ہیں۔

سرد ریگستان یا ٹنڈرا، کے خطوں میں یوریشیا اور شمالی امریکہ کے قطبی علاقوں میں مختصر مدت کے لیے ننھے ننھے پھولوں والی جھاڑیاں گرمیوں میں دو تین ماہ کے لیے آگتی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور لائیکن (Mosses and Lichens) ملتے ہیں۔ سردیوں میں تقریباً نو ماہ تک یہ خطے برف سے ڈھکے رہتے ہیں جب سورج صرف چند گھنٹوں کے لیے نظر آتا ہے۔

حیوانات

کسی خطے کے نباتات اور حیوانات میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ غذا کے علاوہ پیڑ پودے حیوانات کو بود و باش (Habitat) کے لیے عمدہ مسکن عطا کرتے ہیں۔ گرچہ حیوانات یہاں سے وہاں تبدیل مکانی بھی کر سکتے ہیں، لیکن حیوان کی ایک خاص نسل آب و ہوا کی خاص خوبیوں اور سختیوں کو ہی جھیل (برداشت) سکتی ہے۔ حیوانات کی جسمانی ساخت، رنگ، کھانے پینے کے عادات و اطوار وغیرہ ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ایک خاص ماحولیاتی خطہ (Biome) سے دوسرے خطہ میں جانے کے بعد حیوانات کو اپنے اندر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑ سکتی ہیں۔ تبھی وہ وہاں کے نئے ماحول میں رہ سکتے ہیں۔

منطقہ حارہ کے گھنے جنگلوں میں، جہاں زمین دلدلوں سے بھری ہے بندر اور لنگور اپنے لمبے لمبے ہاتھوں اور پیروں، اور انگوٹھوں اور انگلیوں کی وجہ سے اس درخت سے اس درخت پر کود پھاند کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ درختوں پر سینکڑوں اقسام کے پرندے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بندروں کی خوراک بنتے ہیں۔ گھاس کے میدان کھلا ماحول پیش کرتے ہیں۔ جہاں تیز رفتار ہرن اور بارہ سنگھے پائے جاتے ہیں۔ ان ہرنوں اور خرگوشوں پر بسر کرنے والے شیر اور چیتے بھی ہیں۔ ماحولیاتی توازن (Ecological Balance) کے برقرار رکھنے کے لیے نباتات اور حیوانات کے مابین درست رشتہ لازمی ہے۔ غیر منصوبہ بند طور طریقوں کی وجہ سے انسانی سرگرمیاں (Activities) جیسے کاشتکاری، جنگل بانی، مویشیوں کو چرانا، مچھلیاں مارنا یا شکار کرنا وغیرہ نے اس ماحولیاتی توازن (Ecological Balance) کو بگاڑ دیا ہے۔ اور اس وجہ سے سینکڑوں نسلیں ناپید ہوگئی ہیں۔ کان کنی اور بستیاں آباد کرنے کے لیے درختوں کا صفایا، آبپاشی کے لیے ڈیم کی تعمیر، اور تالابوں اور پوکھروں کا بھرتے جانا وغیرہ نے نظام ماحولیات Ecosystem پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔

ایکولوجی اور انسانی سرگرمیاں

(Ecology and Human Affairs) انسان خواہ جہاں کہیں بھی بود و باش اختیار کرے وہ اس ماحول میں رہتا ہے جو نباتات اور حیوانات سے بنتا ہے، اور وہ (انسان) دوسرے جانداروں کی نسبت ماحول پر زیادہ منحصر ہے۔ اس کے تمدنی ارتقا کی وجہ سے وہ دوسرے کسی بھی جاندار کے مقابلے میں زیادہ وسعت سے اور زیادہ طاقت سے ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ انسان ساخت، طبیعت اور نفسیاتی لحاظ سے سبزی خور کے ساتھ ہی ساتھ گوشت خور بھی ہے۔ یعنی انسان "ہمہ خور" یا Omnivorous ہے۔ ہمہ خور ہونے کی وجہ سے انسان کسی بھی ماحول میں اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے وہ تمام اقسام کی غذائی زنجیر (یا سلسلہ Food Chain کا حصہ بنتا ہے جس میں کوئی بھی بڑا جانور (Animal) شامل کیا جاسکتا ہے۔

تمام عضویہ (Organism) اپنے ماحول کو متاثر کرتے ہیں، اور اپنے ماحول کے چھوٹے سے حصے کو بھی ضرور کنٹرول کرتے ہیں۔ انسان دوسرے کسی بھی عضویہ کے مقابلے میں اپنے ماحول کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ (USA)، یا دنیا کے کسی اور بہت زیادہ ترقی یافتہ خطے میں حالات پر انسانی سرگرمیوں، خاص طور سے تخریبی سرگرمیوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے۔ قدرتی عضویہ کو برباد کرکے، اس کو تبدیل کرکے انسان نے اپنے پھیلاؤ کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا ڈالی۔ اپنی سرگرمیوں سے انسان نے زمین کو زیادہ نم (Wet) بھی بنا ڈالا۔ انتہائی خرابی کی حد تک اور خشک زمین کو اور بھی خشک کر ڈالا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خشکی کے نباتات خشکی سے، اور نم زمین کے نباتات نم زمین سے تبدیل مکانی کرکے دوسرے مقامات پر چلے گئے۔ جس کی وجہ سے بیکار کھرپات (Weeds) میں حد درجہ اضافہ ہوا۔ گاجر گھاس، اور جل کمبھی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

ماہرین تحفظ ماحولیات (Conservationists) اس سلسلے میں مٹی کے مختلف استعمال (Soil Utilisation) کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مٹی بننے کا عمل بہت ہی سست ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کھیتی کرنے والے مٹی کی زرخیزی کو جلدی اٹھا لیتے ہیں۔ فصل کی کٹنی (Harvest) کے ساتھ ساتھ ہر مرتبہ مٹی کی زرخیزی کی بربادی ہوتی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کھاد کا استعمال ہوتا ہے جو مٹی کو اور زیادہ خراب کرتی جاتی ہے۔

انسان کی مختلف سرگرمیوں کی وجہ سے ماحول کو سازگار بنانے والی تمام قدرتی طاقتوں کا صفایا ایک بڑے نرالے ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ جسے فلڈ کنٹرول پروجیکٹ کہتے ہیں۔

اس طرح ایکولوجی کے توازن (Ecological Balance) کو انسان کافی حد تک برباد کرتا چلا جا رہا ہے۔

□□□

اردو خبر نامہ

فراق گورکھپوری اور ان کے بزرگ معاصرین: تین روزہ قومی سیمینار

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ کے اشتراک سے پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے کانفرنس ہال میں فراق گورکھپوری اور ان کے بزرگ معاصرین کے موضوع پر تین روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح ڈاکٹر اے آر قدوائی گورنر ہریانہ نے کیا۔ جناب بھوپندر سنگھ ہڈا، وزیر اعلیٰ ہریانہ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے پیش کیا۔ جبکہ ان سے قبل جناب کشمیری لال ذاکر نے سیمینار کی غرض و غایت کا ذکر کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جناب راجن گپتا سکریٹری تعلیمات ولسانی امور ہریانہ، جناب شورمن گوڑ کمشنر ہائر ایجوکیشن، ہریانہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اپنے کلیدی خطبے میں ڈاکٹر علی جاوید نے جو سفارشات پیش کیں ان میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ سہ لسانی فارمولہ کے تحت پانچویں سے دسویں تک ہریانہ کے اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ انھوں نے یہ خواہش بھی کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے ہریانہ میں کسی ایک جگہ کونسل کا ریجنل سنٹر قائم کرنے کے لیے مناسب جگہ کا انتظام کیا جائے۔ اس موقع پر یہ بھی بات سامنے آئی کہ پانی پت میں مولانا حالی کے مکان کو حاصل کر کے وہاں لڑکیوں کے لیے ایک اردو اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اپنی تقریر کے دوران وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھوپندر سنگھ ہڈا نے اردو کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور امید ظاہر کی کہ عزت مآب گورنر ہریانہ اس کام میں پوری طرح سرپرستی فرمائیں گے۔ اپنی تقریر کے دوران گورنر موصوف نے محبان اردو کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ایسے سیمینار ہمیں اپنے بزرگوں کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ اس قسم کے پروگرام اکادمیوں کی جانب سے منعقد ہوتے رہنے چاہئیں، جن سے قلمکاروں کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اردو جیسی شیریں زبان کا کارواں ترقی کی طرف بڑھتا ہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دوسرے دن صبح 10 بجے سیمینار کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر فضلِ امام، ڈاکٹر وہاب اشرفی، پروفیسر انیس اشفاق شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارجمند آرا نے ادا کیے اس اجلاس میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

1. جناب آر ڈی شرما تاثیر...... "فراق گورکھپوری بطور نظم نگار، رباعی نگار و تنقید نگار۔"
2. پروفیسر اصغر عباس...... "انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو نظم"
3. پروفیسر شمیم حنفی...... "فراق، ان کے ہمعصر اور نئی غزل کی روایت"
4. ڈاکٹر عقیل رضوی...... "تین طرح کی شاعری اور فراق"
5. ڈاکٹر افغان اللہ...... "فراق کی شاعری پر مغربی شاعری کے اثرات"
6. پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، نظم "آدھی رات" کا تجزیہ

دوسرا اجلاس دوپہر کے کھانے کے بعد ہوا مجلسِ صدارت میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر ابوذر عثمانی تھے اور نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے نبھائی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔

1. جناب ندیم احمد...... "فراق کی غزل اور روایت کا معاملہ"
2. ڈاکٹر خلیق انجم...... باتیں فراق کی، سوانحی مضمون
3. ڈاکٹر ارجمند آرا...... "بیسویں صدی کی سیاسی وسماجی بساط اور اقبال وحسرت کے ذہن وعمل کی دنیا"
4. ڈاکٹر ابوبکر عباد...... "حسرت کی شاعری چند مباحث"
5. ڈاکٹر نجمہ رحمانی...... "فراق کے بزرگ معاصرین۔ جوش اور اقبال کے حوالے سے"

اگلے روز سیمینار کا تیسرا اجلاس منعقد کیا گیا جس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر راجندر کمار شامل تھے اور نظامت ڈاکٹر ابوذر عثمانی نے کی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔

1. ڈاکٹر شہناز نبی...... "فراق کا تصور عشق روایت سے بغاوت تک"
2. ڈاکٹر سراج اجملی...... "مشاطہ سخن اور صفدر مرزا پوری"
3. ڈاکٹر احمد محفوظ...... "ہماری شاعری کی معنویت آج کے تناظر میں"
4. ڈاکٹر وہاب اشرفی...... "فراق کی شاعری کا مغربی پس منظر"

سیمینار کے چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید عقیل احمد نے کی جس

میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔

1. ڈاکٹر کے رشی..... ''نظام سرمایہ داری اور فراق کے معاصرین بزرگ شعرا''
2. پروفیسر انیس اشفاق..... ''ہماری شاعری، کی اہمیت آج کے تناظر میں''
3. پروفیسر لطف الرحمٰن..... ''جدید نظم نگاری میں منظوم ترجموں کی روایت''
4. پروفیسر ابوذر عثمانی..... ''ہماری شاعری کی اہمیت'' .....(1900 1857)
5. ڈاکٹر کمار پانی پتی..... ''رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اور تہذیب شاعری کی نئی سمتیں''
6. پروفیسر قدیر زماں..... ''عالم کاری اور جدید اردو ادب، فراق اقبال اور ہم عصر شعرا کی معنویت''

ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے سیمینار میں پیش کیے گئے تمام مقالوں کا جائزہ پیش کیا۔ جناب کشمیری لال ذاکر نے سیمینار کی رپورٹ اور سفارشات تحریری طور پر پیش کیں۔ آخر میں ڈاکٹر علی جاوید نے سبھی شرکا اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

جدوجہد آزادی اور مولانا آزاد کی صحافت

● ممبئی، اردو کی کچھ انجانی مگر زبان کی خدمت میں مصروف بستیوں میں سے ایک کا نام پادول ہے جو تاریخی اہمیت کے حامل شہروں جل گاؤں اور بھوساول کے درمیان ہے۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد سارو جنک واچنالیہ بھی ہے جو اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔

اس ہری بھری بستی میں ایک دو روزہ سیمینار بعنوان ''مولانا آزاد: شخصیت اور کارنامے'' منعقد کیا گیا جس میں جناب فیروز بخت احمد، ڈاکٹر اقبال شاہ، جناب عبدالرؤف شیخ، جناب عبدالغنی شیخ، جناب رئیس خاں، جناب شکیل خاں، شیخ اختر حسین صاحب، ڈاکٹر آئی ایم ساجد، جناب ایم رفیق، جناب عبدالوہاب اور جناب ایس ایم انور سمیت اردو کے بہت سے چاہنے والوں نے حصہ لیا۔

جناب فیروز بخت احمد نے اپنے مقالے بعنوان ''مولانا آزاد بطور ایک صحافی'' میں اس بات کا اعتراف کیا کہ مولانا آزاد کی ادبی و صحافتی عظمت سیاست کی ڈیوڑھی پر قربان ہوگئی اور اس کی وجہ سے ان کی نثر نے وہ شہرت نہیں پائی جیسے مرزا غالب کی نثر وشاعری نے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا آزاد نے ''لسان الصدق''، ''خدنگ نظر''، ''ایڈورڈ گزٹ''، ''مرقع عالم''، ''المصائر''، ''مخزن''، ''الندوہ''، ''وکیل''، ''دارالسلطنت''، ''الہلال''، ''البلاغ''، ''اقدام''، ''پیغام''، ''الجامعہ''، ''پیام''، ''المصباح''، ''زمیندار''، ''البشیر''، ''مسلم گزٹ''، ''مساوات''، ''ثقافت الہند'' وغیرہ میں جو تحریر کیا، وہ آج بھی اردو صحافت کا قیمتی اثاثہ ہے۔

اپنے تعارفی کلمات میں ایم رفیق صاحب نے فرمایا کہ انھیں یہ واچنالیہ بنانے کا خیال اب سے تقریباً بیس برس قبل اس وقت آیا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ جل گاؤں کے نزدیک بسے قصبہ پادول میں نہ تو اردو کتب و رسائل کی کوئی دکان ہے اور نہ ہی اردو والوں کے لیے اردو اخبارات، رسائل و کتب کے مناسب جگہ میسر ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایک ٹرسٹ بنا کر اردو کی اس چھوٹی سی بستی میں ایک اردو سینٹر کھولا جس کی شروعات ٹین کی چھت کے نیچے بطور ایک لائبریری کے ہوئی۔ بستی کے لوگ چونکہ اردو کا ذوق رکھتے ہیں، اس لائبریری میں ساڑھے سات ہزار کتابیں جمع ہوچکی ہیں۔ مگر اب تک اسے مہاراشٹر سرکار نے ''اے'' گریڈ کا درجہ نہیں دیا ہے۔ کسی بھی لائبریری کو ''اے'' گریڈ لینے کے لیے یہ دکھانا ہوتا ہے کہ اس میں کم از کم 15 ہزار کتابیں ہیں اور مطالعہ گاہ پر چھت ہونا بھی ضروری ہے اس واچنالیہ کو ''اے'' گریڈ بننے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے مگر یہ اردو کے چاہنے والوں کی اس طرح خدمت کررہا ہے جیسے مولانا آزاد کا ادبی ولولہ اس میں سرگرم ہو۔

جناب عبدالرؤف شیخ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستان کی یک جہتی و یگانگی کی علامت مولانا آزاد کو ایوانِ اقتدار نے وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ حقدار تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ان کو دیا گیا بھارت رتن بھی سادہ ڈاک سے ان کے بھتیجے نورالدین کو کلکتہ روانہ کردیا گیا تھا۔

''اقرا ایجوکیشن سوسائٹی'' کے چیئرمین ڈاکٹر اقبال شاہ نے مولانا آزاد کی مذہبی فکر پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا جدوجہد آزادی ہند کے ایسے رہنما تھے جس نے وطن پرستی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے وطن کے تئیں وفاداری کو محض ایک عام فریضہ ہی نہیں سمجھا بلکہ اسے اسلامی فریضہ جانا۔ شاہ صاحب نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا جب بہت سے ہندوستانی مسلمانوں نے جو پاکستان جانے والے تھے مولانا کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کی گئی تقریر سن کر اپنے بندھے ہوئے بستر کھول دیے۔ اس دو روزہ سیمینار کے آخر میں ماہنامہ ''المصباح'' کے مدیر جناب عبدالغنی شیخ نے سب کا شکریہ ادا کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد سارو جنک واچنالیہ کی جانب سے تمام مہمانانِ خصوصی کو سند پیش کی۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

نئی دہلی میونسپل کونسل میں اردو کلاسیں

● اردو زبان کے فروغ اور اسکی نشرواشاعت کے لیے 2006 میں نئی دہلی میونسپل کونسل نے اپنے یہاں اردو سرٹیفکیٹ کورس اور ایڈوانس کورس کا آغاز کیا۔ چونکہ دہلی سرکار نے پنجابی اور اردو کو دہلی کی دوسری سرکاری زبانوں کا درجہ دیا ہے، اسی کے پیش نظر نئی دہلی میونسپل کونسل کی نائب صدر محترمہ تاجدار بابر کی کوششوں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ دہلی سرکار کے شعبۂ فن وثقافت اور السنہ کے اردو آفیسر جناب اشفاق احمد عارفی کے تعاون اور نئی دہلی میونسپل کونسل کے ہندی اور اردو شعبے کی مساعی سے این ڈی ایم سی کے ملازمین نے سرٹیفکیٹ اور ایڈوانس کورس میں شرکت کرکے کامیابی حاصل کی۔ کامیاب ملازمین کو 23 ستمبر 2007 کو کونسل کی لائبریری میں محترمہ تاجدار بابر نے اسناد تقسیم کیں۔ شری آنند کمار تیواری، جناب اشفاق احمد عارفی اردو آفیسر، ہندی آفیسر جناب نریندر کمار اور ایڈیٹر "پالیکا سماچار" (اردو) جناب ایس ایچ ایم حسینی موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی سرٹیفکیٹ اور ایڈوانس کورس کے لیے نئے سیشن کا بھی افتتاح کیا گیا۔ محترمہ تاجدار بابر نے ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں ترغیب دلائی کہ اس شیریں زبان کو ضرور سیکھیں یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ایک زندہ علامت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ امید ظاہر کی کہ کونسل کے ملازمین انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ اس شیریں زبان کو سیکھیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ زبان کسی کی میراث نہیں ہے اور خود اپنی مثال دی کہ ان کی مادری زبان کشمیری ہے۔ مگر انھوں نے ہندی اور اردو کے علاوہ پشتو زبان بھی سیکھی اور پشتو زبان میں آل انڈیا ریڈیو سے کئی پروگرام بھی پیش کیے۔

عارفی صاحب نے کونسل کے ارباب حل وعقد کی تعریف کی اور کہا کہ اردو کلاسوں کے سلسلے میں دہلی کے دوسرے اداروں کے مقابلے میں نئی دہلی میونسپل کونسل وہ پہلا ادارہ ہے جس نے پیش قدمی کی اور اپنے یہاں کے ملازمین کو اردو پڑھانے کے لیے جگہ بھی فراہم کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے اردو شعبے کے نگراں اور ایڈیٹر "پالیکا سماچار" (اردو) ایس ایچ ایم حسینی اور معاون مدرس لطا؟ ۔ نہ صرف سرکاری طور پر بلکہ ذاتی طور پر کلاسوں کے انعقاد میں جو تعاون دیا وہ قابل تعریف ہے۔

ڈائرکٹر پی آر شری تیواری نے ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی چیز کو سیکھنے کے لیے ذہن میں یہ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ہم ایک ہنر سیکھ رہے ہیں۔ اگر بحیثیت فن کسی چیز کو سیکھنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً کمال پیدا ہوگا۔ ہندی آفیسر جناب نریندر کمار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لسانی تعصب اور تنگ نظری سے ہمیں گریز کرنا چاہیے۔ کیونکہ زبان مشترکہ تہذیب کی علامت ہوتی ہے اور یہ خیال کہ اردو صرف کسی ایک فرقے کی زبان ہے۔ ذہن سے نکال دینا چاہیے اور لسانی تعصب سے بلند ہوکر اس شیریں زبان کو سیکھنا چاہیے۔ (ڈاک سے)

گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک میں مسلمانوں کا کردار

● سہارنپور، 12 ستمبر۔ یہاں سوراج پیٹھ کے زیر اہتمام گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک کے 101 سال پورے ہونے پر ستیہ گرہ تحریک میں مسلمانوں کے کردار پر منعقدہ سیمینار میں اظہار خیال کرتے ہوئے معروف دانشور پروفیسر امتیاز احمد نے کہا کہ 11ویں صدی تک ہندوستان میں ہندو اور مسلم لفظ سے لوگ ناآشنا تھے، انگریزی سامراج نے 1901 کی مردم شماری میں پہلی مرتبہ ہندو اور مسلم لفظ کی بنیاد پر مذہبی شناخت کا جھگڑا کھڑا کیا اور ہندوستان میں ہندو مسلم کی تفریق پیدا کی جس کے نتیجے میں 1937 میں شریعت ایکٹ اور بعد میں ہندو کوڈ بل وجود میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے باوجود گاندھی جی کی کوششوں اور ان کے نظریات کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں نے مذہبی شناخت کے بغیر انگریزی سامراج کے خلاف جنگ لڑی اور آزادی حاصل کی۔ گاندھی جی پیدائش سے ہندو تھے لیکن ان کی سوچ کا دائرہ وسیع تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہندو اور مسلمان باپو کی بات مان لیتے تو ملک تقسیم نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں انھوں نے مسلمانوں پر دہشت گردی کے الزام کو بے بنیاد بتاتے ہوئے کہا کہ بحیثیت مجموعی مسلم معاشرے نے دہشت گردی کو مسترد کردیا ہے۔ انھوں نے دہشت گردی کو گلوبلائزیشن اور معاشی ناہمواری کا نتیجہ قرار دیا۔ تنظیم علمائے ہند کے قومی صدر اور ممتاز عالم مولانا سید انظر شاہ کشمیری نے کہا کہ گاندھی جی اسلام کے نظریۂ مساوات وعدل سے بہت متاثر تھے اور اسلام کے نظریۂ امن کے قائل تھے جس کے اثرات ان کی ستیہ گرہ کی تحریک میں واضح طور پر نمایاں تھے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ستیہ گرہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس تحریک کی پہلی میٹنگ کی صدارت بھی ایک مسلمان عبدالغنی نے کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور خان عبدالغفار خاں نے تقسیم ملک کے بعد بھی پاکستان میں اس تحریک کے پرچم کو بلند رکھا تھا۔ سیمینار کو خطاب کرنے والوں میں سوراج پیٹھ کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نہرو اور راجیو وہرہ کے علاوہ انور علی ایڈووکیٹ، ظہور عالم ایڈووکیٹ اور شتی والیہ شامل تھے۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر ایس کے اپادھیائے نے اور نظامت ارشد قریشی اور عثمان الحق صدیقی نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

احمد آباد میں بہادر شاہ ظفر پر سیمینار

● 1857 کی 150 سالہ اور آزادی ہند کی 60 سالہ تقریبات کے سلسلے میں ایک سیمینار انجمن فروغ ادب کے زیر اہتمام بعنوان ''بہادر شاہ ظفر۔ مجاہد آزادی اور شاعر'' زیر صدارت الحاج توفیق احمد خاں (کاؤنسلر احمد آباد میونسپل کارپوریشن) منعقد ہوا۔ بطور مہمان خصوصی پروفیسر وارث علوی شریک رہے۔ دیگر مہمانان میں پروفیسر محی الدین بمبئی والا، ڈاکٹر نثار احمد انصاری اور جناب رسول احمد شیخ شامل ہیں۔ سیمینار کا آغاز تلاوت قرآن اور نعت پاک سے ہوا۔

سیمینار کے آغاز میں پروفیسر وارث علوی، پروفیسر بمبئی والا اور پرنسپل محمد ابراہیم شیخ کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار انصاری نے ان کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد ان حضرات کا اعزاز کیا گیا۔ جناب صدر کی جانب سے علاقے کی دو معمر شخصیات حافظ بشیر الدین اور شیخ نظام الدین صاحبان کا بھی اعزاز کیا گیا۔

تقریب کے دوسرے حصے میں بہادر شاہ ظفر کے عہد کے سیاسی حالات، مادر وطن کی آزادی کے لیے ان کی عدیم المثال قربانیاں، اور ظفر کی شاعرانہ خصوصیات کے موضوع پر جناب محمد کلیم صدیقی، جناب شبنم انصاری، جناب ابہام رشید نے مقالے پیش کیے۔ جامعہ قاسم العلوم کے طالب علم آصف احمد اور آخر میں مہتمم مولانا محبوب الرحمٰن قاسمی نے موضوع سے متعلق تقریریں کیں۔ مقالہ خوانی کے درمیان جناب معظم ہاشمی اور محمد اسلم راجپوت نے ظفر کی مشہور غزلیں سنائیں۔

پروفیسر محی الدین بمبئی والا نے اپنی تقریر میں ظفر کی شاعرانہ خصوصیات کا محاکمہ کیا۔ انھوں نے ظفر کے ہمعصر شعرا ذوق اور غالب وغیرہ کی شاعری کے مماثل پہلوؤں کے حوالے سے متفرق اشعار سنائے اور اس دور کی شاعری پر غدر کے اثرات کا ذکر کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر وارث علوی نے زوال پذیر اردو زبان و ادب اور تہذیب کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد پر زور دیا۔ موصوف نے اردو زبان کے گوناگوں مسائل اور ان کے حل کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرائی اور چھوٹے چھوٹے علمی، ادبی مذاکروں، تقریری پروگراموں کے ذریعے روز افزوں پھیلتی ہوئی غفلت و جمود کو توڑنے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر نثار احمد انصاری اور جناب رسول احمد شیخ نے پڑھے گئے مقالات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا جناب انیس منیری نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض انجمن کے جنرل سکریٹری وفا جونپوری نے انجام دیے۔ اختتام پر شرکا کی خدمت میں ظہرانہ پیش کیا گیا۔ (ڈاک سے)

ترجمے کی اہمیت

● حیدرآباد، 5 ستمبر۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ حصول علم کے مرحلے میں ترجمے کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ کسی بھی ایک زبان میں اتنا علمی مواد موجود نہیں ہے جو علم کے بحر بیکراں کو سمیٹنے کے لیے کافی ہو۔ وسعت علمی کے لیے ہمیں لامحالہ دیگر زبانوں میں موجود مواد کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ترجمہ ہی واحد راستہ ہے جو اس مواد تک ہماری رسائی کو یقینی بناتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان خیالات کا اظہار آج یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ یوم اساتذہ لکچر کے دوران کیا جس کا موضوع ''اردو ذریعۂ تعلیم میں ترجمے کی اہمیت'' تھا۔ ''فن ترجمہ نگاری'' نامی کتاب کے مرتب ڈاکٹر انجم نے اردو یونیورسٹی میں شعبۂ ترجمہ کے قیام اور وہاں سے ایم اے ترجمہ کورس شروع کیے جانے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس میدان میں روزگار کے بے پناہ مواقع ہیں اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے ترجمے کے لیے لغات کو اپنا مستقل ساتھی بنانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو کسی لفظ کے معنی معلوم بھی ہوں تو بھی لغت دیکھنی چاہیے تاکہ اس لفظ کے مختلف متبادل و مترادف الفاظ بیک وقت سامنے آجائیں اور آپ ان میں سے بہتر کا انتخاب کرسکیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تخلیقی ادب بطور خاص فکشن کے لفظی ترجمے کی مخالفت کی اور منشائے مصنف کی پیش کشی کو مرجح طریقہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ دونوں زبانوں سے وابستہ تہذیب و تمدن، لسانی مزاج اور مخصوص تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اردو کے فروغ و ترویج میں دکن کے رول کی تعریف کی اور کہا کہ ماضی میں بھی یہاں اردو کی ترقی کے لیے سرکاری و نجی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور آج بھی یہاں اس کے لیے پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ موافق ماحول موجود ہے۔

صدر جلسہ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے اردو میڈیم اسکولوں کو معیاری بنانے کے سلسلے میں اردو میڈیم اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو یونیورسٹی میں اس طرح کا ایک سنٹر فعال طریقے سے کام کر رہا ہے۔ قبل ازیں پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے یوم اساتذہ منانے کا پس منظر اور اس کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش نے مہمان خصوصی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اردو میں سوشل سائنس کی تدریس پر ورک شاپ

● پونہ میں مہاراشٹر کاسموپولیٹن ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام پونہ ضلع کے 27 اردو اسکولوں میں دسویں جماعت کو سوشل سائنسز پڑھانے والے

اساتذہ کے لیے ایک دو روزہ تعلیمی ورک شاپ منعقد کیا گیا جس میں تاریخ، جغرافیہ، شہریت اور معاشیات جیسے مضامین کی تدریس کے تعلق سے ان اساتذہ کی بھرپور رہنمائی کی گئی۔ رہنمائی کرنے والوں میں انیس چشتی، مسز ظلِ ہما بارگیر، محترمہ شاہدہ شیخ، روبینہ عطار اور محمد عمر عثمان شامل تھے۔ اس تعلیمی ورکشاپ میں بی ایڈ کالج کی دو طالبات ثنا شیخ اور سشما گائیکواڑ نے بالترتیب تاریخ اور جغرافیہ پر مشتمل دو اسباق بھی لیے، جس سے تعلیمی عمل میں تدریسی وسائل اور تختہ سیاہ پر کیے جانے والے کام کی اہمیت سے شرکا واقف ہوئے۔

ماہر تعلیم جناب انیس چشتی نے دو دنوں تک اپنے لکچر کے دوران شرکا کو جدید ترین تعلیمی وسائل اور نظریات کا استعمال کرتے ہوئے تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات کی تدریس کو دلچسپ بنانے سے متعلق ایسی بہت ساری چیزیں بتائیں کہ اساتذہ چونک گئے۔ اس میں قدیم مصر کی تہذیب اور امریکہ کی جنگِ آزادی کی تاریخ کی تدریس کے دوران موصوف نے ذاتی کیمرے سے اتاری گئی وہ تصویریں دکھائیں جو اہرام مصر، ابوالہول، نہر سوئز، دریائے نیل اور فرعون کی لاش وغیرہ کی تھیں۔ انھوں نے اہرام مصر کا زندہ منظر پیش کرنے کے لیے اہرامِ مصر میں لگے پتھروں کا ایک ٹکڑا بھی اساتذہ کو دکھایا۔

اس ورکشاپ میں تدریسی وسائل، طریقۂ تدریس اور ایس ایس سی امتحانات کے تعلق سے حکومت کی جانب سے جاری کردہ تازہ ترین سرکولرز کی روشنی میں بھرپور معلومات دی گئیں۔

ورکشاپ کے روحِ رواں، ایم سی ای سوسائٹی کے رکنِ انتظامی اکحق شرف الدین نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مختلف مضامین کے لیے اس سطح کے مزید ورکشاپ منعقد کرنے کا وعدہ بھی کیا اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

اردو کو اس کا جائز حق دیا جائے

● سہارنپور، 13 ستمبر۔ متحدہ اردو محاذ کے زیر اہتمام روٹری بھون میں اردو کے ساتھ سرکاری سطح پر کی جارہی ناانصافیوں کے خلاف ایک احتجاجی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو تنظیموں اور سماجی تنظیموں کے ذمے داران نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت مجاہد آزادی ظہور احمد ظہور نے اور نظامت اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر راؤ عبدالستار نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے سابق وزیر مملکت سنجے گرگ نے اردو کو ہندوستان کا تہذیبی ورثہ اور مشترکہ کلچر کی نمائندہ زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد سے مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی سطح پر اردو کے ساتھ مسلسل ناانصافی کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے اور اردو کو اس کا جائز حق دیا جانا چاہیے۔ سنجے گرگ نے جلسے میں پاس کی گئی 9 نکاتی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ ریاستی بیسک ایجوکیشن محکمہ کے 11 جولائی 2007 کے تازہ سرکاری حکم نامے میں اردو کو منظور شدہ مضامین کی فہرست سے خارج کردیا گیا ہے۔ انھوں نے اس حکم نامے کو فی الفور واپس لینے کا مطالبہ ریاستی سرکار سے کیا۔

جلسے میں پاس کی گئی 9 نکاتی قرارداد میں اس تازہ سرکاری حکم نامے پر غم و غصے کا اظہار کرنے اور اس کو واپس لیے جانے کا مطالبہ کرنے کے علاوہ اردو بی ٹی سی کی ٹریننگ پوری کرنے والے افراد کی فوری تقرری، معلم اردو کی سند کو بی ٹی سی کے مساوی قرار دے کر ملازمت دیے جانے، اردو میڈیم اسکولوں کی بحالی اور اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔

قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے انور علی ایڈووکیٹ نے کہا کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے اور سرکاری اسکولوں میں پرائمری سے ثانوی درجات تک اردو کو بحیثیت مضمون پڑھائے جانے کا نظم کیا جائے۔ پروفیسر جلال عمر نے کہا کہ اردو کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑے بغیر اردو کا مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ ارشد قریشی نے کہا کہ اردو کو ایک خاص سازش کے تحت مسلمانوں کی زبان قرار دے کر تہہ تیغ کیا گیا ہے۔ پروگرام کے کنوینر شمین زبیری نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو کے ساتھ امتیازی سلوک اور سازشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اپنی صدارتی تقریر میں مجاہد آزادی ظہور احمد ظہور نے اردو کی بقا کے لیے آزادی کے بعد سے کی گئی مسلسل جدو جہد کا ذکر کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ادب کی معنویت ہمیشہ برقرار رہتی ہے

● نئی دہلی، 13 ستمبر۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز تبدیل ہوجاتی ہے لیکن وقت کی رفتار 'ادب' پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالتی اور ادب کی اہمیت اور معنویت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ملک زادہ منظور احمد نے آج پارلیمنٹ میں راجیہ سبھا کے کانفرنس روم میں معروف شاعر فصیح چودھری کے ہندی میں شائع شدہ شعری مجموعے "اور میں پیاسا رہا" کی رسم اجرا کے موقع پر کیا۔ مجموعے کا اجرا چیئرمین ہاؤسنگ کمیٹی راجیہ سبھا اور دہلی پردیش کانگریس کے صدر جے پرکاش اگروال نے کیا۔ اس موقع پر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ایڈیٹر عزیز برنی اور معروف فلم اسٹار رضا مراد اور ان کی اہلیہ بھی موجود تھیں۔ تقریب کی صدارت ملک زادہ منظور نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ان کے صاحبزادے ملک زادہ جاوید نے انجام دیے۔

مہمان خصوصی جے پرکاش اگروال نے کہا کہ لفظ دلوں کو چھو لیتے ہیں

اور ان میں وہ تاثیر ہوتی ہے کہ انسان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں اپنی بات کو بہت کم الفاظ میں بہت اچھے ڈھنگ سے کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسان کو اپنی شخصیت بنا کر رکھنی چاہیے۔ انسان مقابلہ کرنے سے کمزور نہیں ہوتا بلکہ جھکنے سے کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے اتنا نہ جھکا جائے کہ دستار گر جائے۔

عزیز برنی نے کہا کہ میں 1857 کے واقعے کو غدر نہیں مانتا بلکہ میرے نزدیک وہ جدوجہد آزادی کی ابتدا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آزاد تو ہوگئے لیکن مکمل آزادی آج تک نہیں ملی اور ذہنی طور پر ہم آج بھی کہیں نہ کہیں ایسی طاقتوں کے غلام ہیں جو اس ملک پر قابض رہے ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ معروف فلم اسٹار رضا مراد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فصیح چودھری میرے دوست ہی نہیں بلکہ بھائی بھی ہیں اور ان سے میرا دیرینہ تعلق ہے۔ وہ میرے سکھ ہی نہیں دکھ کے بھی ساتھی ہیں اور ان سے ایک ایسا تعلق ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر اشوک معتز نے کہا کہ فصیح چودھری کی شاعری میں جذبات کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعر کوئی بات کہتا ہے تو اس کے معنی بہت دور تک جاتے ہیں اور وہ سماج میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس موقع پر 'فریڈم فائٹر میموریل فاؤنڈیشن' کی جانب سے شاعر جاوید عرشی، ملک زادہ جاوید اور فصیح چودھری کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد ازاں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی کنوینر محترمہ راشدہ باقی تھیں۔ محفل مشاعرہ کی نظامت فصیح اکمل قادری نے کی جس میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، فصیح چودھری، جاوید عرشی، فصیح اکمل قادری، ملک زادہ جاوید، راشدہ باقی، افضل منگلوری، جاوید مشیری، ضمیر ہاپوڑی اور مسرت انجم وغیرہ نے اپنے کلام سے نوازا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ٹیچروں کی تقرری
اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا ردعمل

● الٰہ آباد ادبی و لسانی قومی تنظیم 'اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن' نے اردو ٹیچر تقرری سے متعلق الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس فیصلے نے ثابت کردیا ہے کہ سابق وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ کی حکومت نے ریاست کے اردوداں عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

تنظیم کی طرف سے جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ ریاستی حکومت نے 'اردو بی ٹی سی اسپیشل ٹریننگ' کو نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (این سی ٹی ای) سے منظور ہی نہیں کرایا اور 'اردو ٹیچر' کی نئی پوسٹ منظور نہیں کی بلکہ جنرل اسسٹنٹ ٹیچر کی پوسٹ کو نیشنل کونسل کی پوسٹ میں تبدیل کردیا۔ اس کے ساتھ ہی یوپی بیسک ایجوکیشن بورڈ نے درجہ ایک سے آٹھ تک اردو میڈیم سے پڑھانے کے لیے کوئی حکم ہی پاس نہیں کیا تو اردو میڈیم سے پڑھانے کے لیے 'اردو بی ٹی سی ٹریننگ' کیسے کرائی جاسکتی ہے۔ ریاستی حکومت نے جب نرسری و پرائمری اسکول کے نصاب میں اردو مضمون متعین ہی نہیں کیا ہے تو اردو ٹیچر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لہٰذا عدالت نے اردو ٹیچر کی تقرری سے متعلق تینوں حکم ناموں کو مسترد کردیا۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے وزیر اعلیٰ مایاوتی سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ عدالت عالیہ کے ڈویژن بنچ کے فیصلے مورخہ 24-08-2004 کے نفاذ میں ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کی تعلیم پرائمری تا سیکنڈری بحیثیت ایک مضمون کے لازمی کرنے کا اعلان کرکے لاکھوں اردو ٹیچروں کی پوسٹ منظور کرے اور سب سے پہلے بی ٹی سی اردو کے مساوی 'معلم اردو' بیروزگار سند یافتگان کو اردو ٹیچر کی پوسٹ پر ملازمت دے۔ اس کے ساتھ ہی دو سالہ اردو بی ٹی سی ٹریننگ کو بھی بحال کرے کیونکہ عدالت نے اس ٹریننگ کو اس لیے مسترد کیا ہے کہ اردو ٹیچر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

جہاد کے معنی دفاع اور صبر کے ہیں

● نئی دہلی، 5 ستمبر۔ اسلام میں جہاد کے معنی دفاع اور صبر کے ہیں قرآن نے صبر کو شجاعت قرار دیا ہے ان خیالات کا اظہار انجمن عباسیہ رجسٹرڈ دہلی کے زیر اہتمام ولادت حضرت عباس ابن علی علیہ السلام کے موقع پر مسجد شیعان علی حوض سوئیوالان میں مولانا محسن تقوی نے کیا۔ ڈائرکٹر کلچرل ہاؤس جمہوریہ اسلامی ایران ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی نے کہا کہ حضرت عباس امت سرکار دو عالم کی ایک عظیم المرتبت شخصیت ہیں۔ آپ حضرت امام حسینؓ سے وہی تقرب رکھتے ہیں جو رسول اکرمؐ سے اس صورت میں رکھتے ہیں جب وہ عہد رسولؐ میں ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فتح و کامرانی جنگی ساز وسامان سے نہیں بلکہ سچے ارادے، پختہ ایمان اور کامل یقین سے حاصل ہوتی ہے جنگ بدر اور معرکۂ کربلا اس کا سب سے واضح اور روشن نمونہ ہیں۔ جشن کی صدارت مولانا سید کلب حسین زیدی نے کی۔ جشن کا آغاز خصال مہدی نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور نعت پاک سید ولایت علی نے پیش کی۔ جشن کی نظامت کرتے ہوئے سید قمر عباس قمر نے کہا کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد اور کردار میں بلندی پیدا کریں تا کہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکے۔ انجمن کے صدر الحاج صفدر علی دہلوی، ذاکر مرزا قزلباش دہلوی، الحاج ناطق عباس سالکھوی، ظفر علی دہلوی، رضوان حسینی نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مرکزی اور صوبائی سرکار کو میمورنڈم

● باغپت، 6 ستمبر۔ آل انڈیا اردو تنظیم نے ایک میمورنڈم کے ذریعے مرکزی اور صوبائی سرکار سے مطالبہ دوہرایا ہے کہ کم از کم پرائمری سطح کے سبھی سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم مسلم بچوں کو ہی اردو پڑھوانے کا لازمی انتظام کردیا جائے تاکہ کسی حد تک اس تعلیمی نظام میں اردو بھی زندہ رہ سکے۔ اردو تنظیم نے اس صورت حال پر بڑی تشویش اور ناراضگی ظاہر کی ہے کہ سرکاری اسکولوں کے نصاب سے مکمل طور پر اردو کو خارج کردیا گیا ہے۔ لہٰذا اردو پڑھنے کے خواہشمند طلبہ بھی لازمی طور سے سنسکرت پڑھنے پر مجبور ہیں۔ اردو تنظیم نے سرکار سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو سرکاری طور پر زندہ رکھنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ سرکار کم از کم اردو مادری زبان کے طلبہ کو ہی اردو پڑھانے کا بندوبست کرائے۔

اردو تنظیم نے مرکزی اور صوبائی سطح پر اردو کے نام پر قائم اداروں اور انجمنوں سے بھی یہ اپیل کی ہے کہ وہ اپنے وسائل و ذرائع کو بروئے کار لاکر عملی اقدامات کے لیے آگے آئیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انڈو قطر اردو مرکز کی طرف سے
حکیم عبدالحمید رننگ ٹرافی دینے کا فیصلہ

● نئی دہلی، 12 ستمبر۔ انڈو قطر اردو مرکز (دوحہ) اردو کی ترویج و ترقی کے لیے 1988 سے ہر سال دوحہ میں مختلف موضوعات پر انعامی بحث و مباحثہ کے پروگرام منعقد کرتا رہا ہے۔ امسال انڈو قطر اردو مرکز (دوحہ) انتظامیہ نے یہ مقابلہ دہلی میں بھی شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں دہلی اور دوحہ سے جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیے کے مطابق اس مقابلے کے لیے بانی ہمدرد حکیم عبدالحمیدؒ کے نام پر حکیم عبدالحمید رننگ ٹرافی مختص کی گئی ہے۔ یہ پہلا کل ہند سالانہ بین المدارس اردو مباحثہ 2007 بہ تعاون ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی بعنوان ''مسلمانان ہند کی پسماندگی کی ذمے دار حکومت نہیں وہ خود ہیں، ہمدرد کنونشن ہال ہمدرد یونیورسٹی تغلق آباد میں یکم تا 2دسمبر 2007 کو منعقد ہوگا۔

اس مقابلے میں دس ٹیمیں دہلی سے اور دس بیرون دہلی سے شمولیت کرنے کی مجاز ہوں گی۔ ضابطے کے مطابق ایک اسکول سے ایک ٹیم نمائندگی کرے گی جو دو طلبہ یا طالبات پر مشتمل ہوگی۔ ایک فرد موافقت میں دوسرا مخالفت میں اپنے دلائل پیش کرے گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی برائے مائنوریٹیز ایجوکیشن، حکومت ہند
اردو یونیورسٹی، ریجنل سینٹر، بھوپال کا دورہ

● مرکزی وزارت انسانی وسائل و ترقیات کی طرف سے ملک بھر میں اقلیتوں کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے اور سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم قومی اقلیتی تعلیمی مانیٹرنگ کمیٹی کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے پچھلے دنوں بھوپال کا دورہ کیا اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے منتظمین، ماہرین تعلیم، سماجی خدمتگاروں اور عام لوگوں سے اقلیتی تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ نیز تعلیمی صورت حال میں بہتری کے لیے تجاویز حاصل کیں جو حکومت ہند کو پیش کی جائیں گی۔

اقلیتی تعلیمی مانیٹرنگ کمیٹی کے چیئرمین اور اراکین نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سینٹر، بھوپال کا بھی دورہ کیا۔ اس موقع پر مانیٹرنگ کمیٹی کے چیئرمین جناب زیڈ۔ اے نقوی اور اراکین کمیٹی کے اعزاز میں ایک تعارفی جلسے اور پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، جس میں اراکین کمیٹی کا تعارف پروفیسر محمد حلیم خاں، سابق چیئرمین ایم۔ پی مدرسہ بورڈ نے کرایا، جو خود اس کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ اس کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ریجنل سینٹر، بھوپال کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد احسن نے کمیٹی کے چیئرمین اور ممبروں کا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ بھوپال میں اردو یونیورسٹی ریجنل سینٹر کا قیام 2005 میں ہوا اور تقریباً (1000) سے زائد طلبہ و طالبات یہاں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کورسز مثلاً M.A. (Urdu, History and English), B.A., B.Sc., B.Com میں انرولڈ ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھوپال میں تعلیمی سال 2007-08 سے ریگولر موڈ پر B.Ed. کورس کا آغاز بھی کیا ہے جس کی فیس صرف -/2500 سو روپے ہے جو غالباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کی فیس سے کم ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن نے وفد کو یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی یہاں مستقبل میں اردو میڈیم کے ماڈل اسکول اور آئی ٹی آئی جیسے ووکیشنل کورسز شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لیے اردو یونیورسٹی کو زمین کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنا کیمپس بنا سکے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم پٹھان نے وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش کو ایک خط بھی لکھا ہے۔ اس لیے یونیورسٹی کی جانب سے، میں کمیٹی کے اراکین سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ کمیٹی وزیر اعلیٰ سے اپنی ملاقات میں اس بات کو رکھے تاکہ یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا کیمپس بن سکے جس سے مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کی اردو آبادی کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا اور روزگار کے نئے مواقع سامنے آئیں گے۔ مانیٹرنگ کمیٹی کے اراکین نے وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش سے اپنی ملاقات کے دوران وائس چانسلر کے مکتوب پر

توجہ دلائی۔ اس پر فوراً کارروائی کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے اپنے سکریٹری جناب سنتوش مشرا کو یہ ہدایت دی کہ وائس چانسلر کے مکتوب پر الاٹمنٹ کی کارروائی کر کے مجھے اطلاع دی جائے۔ نیز انھوں نے اراکین کو یہ یقین دہانی کرائی کہ اردو یونیورسٹی کو زمین دی جائے گی۔

پریس کانفرنس میں جناب زیڈ۔ اے نقوی، چیئرمین نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی برائے اقلیتی تعلیم، حکومت ہند نے نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتی طبقے کی پسماندگی کا واحد حل عصری اور پیشہ ورانہ تعلیم ہے، انھوں نے بتایا کہ مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل نو کے لیے -/500 کروڑ روپے فنڈ کی فراہمی مرکزی حکومت کے زیرِ غور ہے۔ مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مدرسوں میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کا ذکر کرتے ہوئے انسانی ترقی وسائل کے وزیر شری ارجن سنگھ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم کے اسکولوں اور ان کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کو گرانٹ فراہم کی گئی ہے۔ پریس کانفرنس میں جناب زیڈ۔ اے نقوی کے علاوہ اراکین کمیٹی، پروفیسر محمد حلیم خاں، حسام صدیقی، پروفیسر صابرہ حبیب، اے۔ آئی۔ سی۔ ٹی۔ ای کے ریجنل ڈائرکٹر شری سنجے شرما اور کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (MANUU) کی پرنسپل پروفیسر اے۔ گریوال بھی موجود تھیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر سادات خاں کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

انتظار حسین پریم چند فیلوشپ سے سرفراز

● نئی دہلی، 10 ستمبر۔ پریم چند اردو اور ہندی زبان کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ دونوں زبانوں میں یکساں اہمیت کے مالک ہیں اور انھوں نے کہانی کی ایک پوری روایت قائم کی۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی کی پہلی پریم چند فیلوشپ حاصل کرنے والے پاکستان کے معروف فکشن نگار انتظار حسین نے آج ساہتیہ اکادمی میں منعقد اپنی استقبالیہ تقریب کے دوران کیا۔ اس تقریب کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے صدر اور معروف نقاد گوپی چند نارنگ نے کی۔ انتظار حسین نے کہا کہ پریم چند فیلوشپ ملنا ان کے لیے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنوبی ایشیا میں ہندوستان ایک بہت اہم ملک ہے جس نے پہلی بار پریم چند فیلوشپ کی شروعات کی ہے اور پہلی فیلوشپ کے لیے ہندوستان کے باہر کے کسی شخص کا انتخاب کیا جانا واقعی قابل ستائش ہے۔

انھوں نے کہا کہ پریم چند سے میرا رشتہ نیا ہے۔ میں نے شروع میں پریم چند کو بہت کم پڑھا تھا اس لیے مجھ پر ان کا اثر بھی کم تھا۔ انتظار حسین نے کہا کہ اکثر یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ پریم چند کا بڑا افسانہ ''کفن'' ہے۔ میں حیران ہوں کہ کفن پر آکر پڑھنے والے کیوں اٹک گئے حالانکہ میں مانتا ہوں ''پوس کی رات'' کفن سے بھی بڑی کہانی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ ''گئودان'' پہلے اردو میں لکھا گیا یا پہلے ہندی میں لکھا گیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ پریم چند ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے یہاں دونوں زبانیں گلے ملتی ہیں۔ وہ دونوں زبانوں میں یکساں اہمیت کے مالک ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پریم چند اردو اور ہندی کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہانی کی ایک پوری روایت قائم کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں فادر آف اردو اسٹوری'' کہا جاتا ہے اور ان کی یہ حیثیت قائم ہے۔ انتظار حسین نے اس موقع پر اپنی کہانی بھی سنائی۔ جس کے بعد سوال و جواب کا دور چلا۔

اس موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انتظار حسین کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے تراجم کے ذریعے ان کی کئی تخلیقات ہندوستان کے غیر اردوداں قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ ہر بڑا فنکار ان ترجیحات سے پہچانا جاتا ہے جو اپنے زمانے میں اسے دوسروں سے الگ کرتی ہوں۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں یہ خاصیت موجود ہے۔ ان کے یہاں تہذیب وثقافت اور تاریخ کے تعلق سے لکھنے کا اپنا منفرد طریقہ اور رنگ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں ان کی سوچ اور کلچر کا تصور سب سے اہم چیزیں ہیں۔ ان کا کلچر کا تصور ایسا تصور ہے جس کے بغیر ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ ہماری پہچان مکمل نہیں ہوسکتی۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انتظار حسین کی زبان پریم چند کی روایت کی ملی جلی زبان ہے اور سرحد کے اس پار بھی اور سرحد کے اس پار بھی وہ اردو فکشن کے اہم نمائندہ ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انتظار حسین کا استقبال

● علی گڑھ، 13 ستمبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے انتظار حسین کی آمد پر ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر خورشید احمد نے انتظار حسین کی آمد پر ان کا پرجوش خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین کے تخلیقی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور معاصر اردو فکشن پر اس کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر راشد انور راشد نے انتظار حسین کی زندگی کے

اہم واقعات اور تاریخوں پر روشنی ڈالی اور علی گڑھ سے ان کے قلبی و ذہنی تعلق کی وضاحت کی۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ انتظار حسین نے دوسرے عام فکشن رائٹرس کے برخلاف خود کو اپنے ظاہری اور خارجی حوالوں میں کم سے کم پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں حافظے کا مسلسل عمل موجود ہے ان کے افسانے اور ناول ہمہ جہت ہیں۔

انتظار حسین نے کہا کہ اس دانش گاہ میں آکر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تاریخ اور ایک خاص عہد میں سانس لے رہا ہوں۔ اس درس گاہ کی تہذیب اور روایتیں میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا مشہور افسانہ ''کشتی'' اپنے مخصوص لہجے میں پیش کیا۔ افسانے کے اختتام پر طلبہ اور اساتذہ نے ان کی کہانی اور فن سے متعلق چند سوالات قائم کیے اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کہا کہ ہمیں انتظار حسین کی کہانیوں کو مزید سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ انتظار حسین واقعات بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ Narrative کے پیچھے موجود محرکات سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک عجیب سی سرّیت ہے جو ان کے ناولوں اور افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ زبان کا استعمال نہایت خلاقانہ طور پر اور خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھوں نے زبان کو عمدگی کے ساتھ برتا ہے اور اس کے ذریعے حقیقت اور کرداروں کی نفسیات کی تہہ تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ناظم جلسہ پروفیسر صغیر افراہیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے میں پروفیسر شہر یار، قاضی عبدالستار، زاہدہ زیدی، شافع قدوائی، افتخار عالم، اطہر صدیقی اور سعید الظفر چغتائی جیسی اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ (اخبار مشرق، نئی دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بزم افسانہ کا انعقاد

● نئی دہلی، 11 ستمبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بزم جامعہ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام آج سی آئی ٹی آڈیٹوریم میں محفل افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر مشیر الحسن نے کی۔ معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے اپنی کہانی ''ہندوستان سے ایک خط'' پڑھ کر سنائی جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ انتظار حسین نے روایت اور انحراف کے امتزاج سے اپنی کہانیوں کو تخلیقیت کا جامہ عطا کیا ہے، غالباً اسی لیے ان کی کہانیاں انسانی معاشرے کی فہم کا ذریعہ ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے انتظار حسین کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز 1948 سے کیا جو اب تک جاری ہے البتہ ان کی شناخت ''آخری آدمی'' سے قائم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اچھا ادیب اپنے حال اور ماضی دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انتظار حسین کی تحریریں صرف حال گزیدہ نہیں ہیں بلکہ ان میں مستقبل کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ وہ اپنے لفظوں سے ایک تہذیبی فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ انتظار حسین نے کہانی سنانے سے قبل جامعہ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ یہاں آکر مجھے لگتا ہے کہ میں بھی ''اسی شہر آرزو'' کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوں۔ اس کے بعد انتظار حسین نے اپنی کہانی پڑھ کر سنائی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ انتظار حسین کی کہانیوں میں ہندوستانی تہذیب کی بوقلمونی اتحاد کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس موقع پر وائس چانسلر نے ادیب اور مورخ کے باہمی رابطے پر زور دیا اور کہا کہ انتظار حسین کی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں ایک مورخ بھی چھپا بیٹھا ہے مگر یہ انتظار حسین کا فن ہے کہ وہ ہر جگہ ادیب اور مورخ کے کردار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ انتظار حسین کی کہانیوں میں تقسیم ہند کا موضوع بہت نمایاں ہے۔ بزم جامعہ کی ایڈوائزر پروفیسر شہناز انجم نے جلسے کی نظامت کی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کا آغاز حافظ جہانگیر اکرم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اس موقع پر شعبۂ اردو اور دیگر شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات نے خصوصیت سے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مرکز ادب و سائنس کا آٹھواں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد

● مورخہ 19 اگست بروز اتوار ساڑھے دس بجے دن سے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ڈی سی اے اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے دو سنٹرس SIIT اور SCTGC کے نام سے رانچی میں چل رہے ہیں جن کا آٹھواں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد YMCA ہال رانچی میں، منعقد ہوا۔

اس جلسے کے مہمان خصوصی جناب عالمگیر اسپیکر جھارکھنڈ اسمبلی تھے۔ صدارت ڈاکٹر عبدالسبحان وائس چیئرمین جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل نے کی، دیگر معزز مہمانوں میں اے ڈی جی پی جھارکھنڈ جناب نیاز احمد آئی پی ایس اور ڈاکٹر مسز منجو سنہا پرنسپل رانچی ویمنس کالج موجود تھیں۔

مہمان خصوصی عالمگیر عالم صاحب نے اپنی تقریر میں مرکز ادب و سائنس کی ٹھوس تعلیمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے پورے ملک اور خاص کر جھارکھنڈ میں مسلمانوں کی اعلیٰ تکنیکی تعلیم میں پسماندگی کا ذکر کیا اور کہا کہ حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کے ذریعے ہزاروں اردو دانوں کے لیے کمپیوٹر کی تربیت کو آسان بنا کر بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، پچھلے نو برسوں میں مرکز ادب و سائنس کے زیر اہتمام مختلف کورسز کے تقریباً 4500 طلبہ وطالبات اعلیٰ ڈگری کی سطحوں تک کمپیوٹر کی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو کر عملی زندگی میں اپنا مقام بنا چکے ہیں حکومت جھارکھنڈ جلد ہی ٹرسٹ کے تعلیمی

اداروں کے لیے شہر میں کچھ زمین الاٹ کرے گی۔

مہمان اعزازی نیاز احمد صاحب آئی پی ایس نے اپنی تقریر میں کہا کہ یوں تو ہر دور میں علم کی اہمیت رہی ہے، دور حاضر میں تو تعلیم یافتہ ہونا انتہائی ضروری ہے کہ آج ہر میدان میں تعلیم کی جو سہولتیں حاصل ہیں انھیں ہماری نئی پود کو ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر منجو سنہا نے تعلیم کے بنیادی مقاصد کو 3H سے واضح کیا یعنی تعلیم ایسی ہو جو ہیڈ یعنی ذہن و دماغ Heart اور ہینڈ یعنی ہاتھ کو باوقار رزق کے لیے تیار کر سکے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالسبحان نے ڈپلومہ پانے والے تمام نوجوانوں کو مبارکباد پیش کی پروفیسر احمد سجاد کے استقبالیہ او رافتتاحی کلمات سے جلسے کا آغاز ہوا۔ ٹرسٹ کی چیئر پرسن ڈاکٹر رفعت آرا اور محمد یوسف انصاری کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر 48 طلبہ و طالبات کو کمپیوٹر ڈپلوما کی اسناد تقسیم کی گئیں۔ (ڈاک سے)

کشمیری لال ذاکر کو یونیسکو ایوارڈ

● سال 2007 کا یونیسکو ایوارڈ جن شکشن سنستھان چنڈی گڑھ کو دیا گیا ہے۔ یہ حکومتِ ہند کا ایک ادارہ ہے اور جناب کشمیری لال ذاکر سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی اس کے چیئرمین ہیں۔ انھیں یہ ایوارڈ محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل صدر جمہوریہ ہند نے اپنے مبارک ہاتھوں سے 8 ستمبر 2007 کو پیش کیا ہے۔ یہ دن بین الاقوامی لٹریسی ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے یہ یونیسکو کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے جس میں پچاس ہزار روپئے اور ایک توصیفی سند سے نوازا جاتا ہے۔ (ڈاک سے)

ندا فاضلی کو نکٹ بہاری سروج انعام

● گوالیار، اردو کے مشہور شاعر ندا فاضلی کو ہندی کے گیت کار اور نامور کوی نکٹ بہاری سروج کی یاد سے وابستہ ''سروج اعزاز'' سے نوازا گیا۔ یہ تقریب گوالیار کے چیمبر آف کامرس کے ہال میں ہوئی ندا فاضلی کو گلدستہ، شال، ناریل اور گیارہ ہزار روپئے کی رقم پیش کی گئی۔ ندا فاضلی نے سروج جی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ''میں نے کویتا کی یاترا مکٹ بہاری سروج کی انگلی پکڑ کر شروع کی تھی۔ اس لیے میں مانتا ہوں کہ مجھے عطا کیا گیا اعزاز ایک فرد کا اعزاز نہ ہو کر ایک دچار دھارا کا اعزاز ہے۔'' غالب کے مشہور شعر بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ کے حوالے سے انھوں نے کہا'' سروج جی کی زندگی اور ادب کا سفر آدمی سے انسان بننے کا سفر ہے۔ بیشک وہ پیدا آدمی کی طرح ہوئے لیکن آخری سانس انھوں نے انسان کی طرح لی تھی۔''

اس سے قبل مہمان خصوصی اور ممبر راج سبھا جناب ادے پرتاپ سنگھ نے کہا کہ بھارت کے آئین کی تمہید میں اخوت، مساوات، بھائی چارے، سیکولرازم اور جمہوریت کے اصول شامل ہیں۔ سروج کی شاعری ان قدروں کی حامل ہے۔ سروج کے گیتوں کا مطالعہ کرنے والوں کو آئین کی ان قدروں کو علیحدہ سے یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جن وادی لیکھک سنگھ اور انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا'' سروج جی کی شاعری انسانی سروکار کی شاعری ہے۔''

انجمن کی گوالیار شاخ کے صدر پروفیسر ودی پی سکسینہ نے کہا کہ آزادی سے پہلے ریاست گوالیار میں دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو ہی تھی۔ آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ راجستھان کی طرح مدھیہ پردیش میں بھی کچھ سرکاری آسامیاں اردو جاننے والوں کے لیے مخصوص کی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ انجمن کا ایک وفد اس سلسلے میں ارباب حکومت سے جلد بھوپال جا کر ملے گا۔

وقار صدیقی نے اردو میں سپاسنامہ پڑھا جس میں ندا فاضلی کے جمہوری اور سیکولر نظریات اور ان کی فنی کاوشوں کا اعتراف کیا گیا ہے اور ہندی میں سروج جی کی بیٹی ماننا سروج نے سپاسنامہ پڑھا۔ پروگرام کی نظامت رام پرکاش ترپاٹھی نے کی اور شکریہ راکیش بھارگو نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جناب محمود عالم پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری نامزد

● مالیر کوٹلہ، پنجاب سرکار کی جانب سے جناب محمود عالم سینئر اردو لیکچرر گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کو پنجاب اردو اکادمی کا سکریٹری نامزد کیا گیا ہے اور انھوں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے۔ موصوف ایک عرصے تک یو جی سی کوچنگ سینٹر برائے امتحانات مقابلہ جات کے ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔

گہوارۂ اردو سرزمین پنجاب پر تقسیم وطن کے بعد حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں اردو کے مراکز رفتہ رفتہ زبوں حالی کا شکار ہو گئے۔ مالیر کوٹلہ مشرقی پنجاب میں واحد شہر بچا تھا۔ جہاں اردو کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام ہے۔ اس شہر کی تعلیمی و ادبی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے پنجاب سرکار نے یہاں اردو اکادمی کا قیام مناسب سمجھا۔

محمود عالم صاحب نے اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد کہا کہ پنجاب میں اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اردو کا سرزمین پنجاب سے جو رشتہ رہا ہے اسے بحال کیا جائے گا اور اس کے لیے سرکار کے تعاون سے جلد ہی ایک تعمیری لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ اردو زبان و ادب کی ترقی

کے ساتھ ساتھ اردو قلمکاروں اور محبانِ اردو کی خواہشات کا بھی احترام کیا جائے گا۔ اس موقعے پر معززینِ شہر اور محبانِ اردو نے پروفیسر محمود عالم کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ آپ اکادمی کو فعال بنائیں گے۔

(پریس ریلیز)

یوم اساتذہ کے موقع پر ٹیچرز کو ایوارڈ

● نئی دہلی، 5 ستمبر۔ یوم اساتذہ کے موقع پر اساتذہ کو ریاست کا بہترین استاد ہونے کا ایوارڈ دینے کے لیے دہلی سرکار کے محکمۂ تعلیم نے تال کٹورہ اسٹیڈیم میں ''اساتذہ ایوارڈ تقریب 2007'' منعقد کی گئی جس میں دہلی کے وزیر تعلیم اروندر سنگھ لولی نے دہلی میونسپل کارپوریشن اوکھلا گرلز اردو میڈیم اسکول کے سینئر استاد محمد غیاث کو اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازا۔ واضح رہے کہ محمد غیاث دہلی سرکار کے 69 اساتذہ میں اکیلے مسلم استاد ہیں جنھیں یہ ایوارڈ ملا ہے۔ اس سے قبل بھی محمد غیاث 2004 میں علاقائی ایوارڈ اور 2005 میں کارپوریشن ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

تقسیم ایوارڈ کے موقع پر اروندر سنگھ لولی نے اعلان کیا کہ سرکار سی آئی آئی کے ساتھ سمجھوتہ کر کے جلد ہی راجدھانی میں 50 ووکیشنل اسکول کھولنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس موقع پر کچھ اساتذہ نے اپنے مطالبات کے سلسلے میں ٹیچرس ڈے کا بائیکاٹ بھی کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایم اے قریشی کو محمد خلیل بال وگیان ایوارڈ

● نئی دہلی، 6 اگست۔ پریاگ وگیان پریشد کی جانب سے 2006 سے ''محمد خلیل بال وگیان'' انعام کا آغاز کیا گیا ہے۔ الہٰ آباد کی اس سائنسی کاؤنسل نے اپنا پہلا انعام ایم اے قریشی کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ انعام ان کو رسالہ سائنس کی دنیا اردو میں شائع ہوئے مضامین پر دیا گیا ہے۔ یہ انعام سائنسی کاؤنسل نے ''سائنس کی دنیا'' کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل کے اعزاز میں شروع کیا ہے جو اردو اور ہندی سائنسی ماہرین کو دیا جائے گا۔ ایم اے قریشی گزشتہ 35 برسوں سے سائنس کو اردو زبان میں مقبول بنانے میں سرگرم ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ساجد رشید کے ہندی افسانوں پر قومی انعام

● اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی، مدیر ''نیا ورق'' جناب ساجد رشید کو ان کے ہندی افسانوں کے مجموعے ''سونے کا دانت'' پر مرکزی ہندی ڈائریکٹوریٹ (دہلی) کے کل ہند غیر ہندی علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کے زمرے میں ایک لاکھ روپے کے انعام سے نوازا گیا ہے۔ قومی سطح کے اس ایوارڈ کے لیے متعدد کتابوں میں سے سال 2005 کے لیے کتاب ''سونے کا دانت'' کا انتخاب عمل میں آیا۔ ساجد رشید کو حال ہی میں ساہتیہ اکادمی کا ترجمے کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

برطانیہ میں دینی مدارس

● لندن، 11 ستمبر۔ حکومت برطانیہ نے اس ملک میں نجی مسلم اسکولس (دینی مدارس) کو اپنے زیر انتظام لینے کی کوشش کرتے ہوئے، ان مذہبی اداروں کو رقومات کی پیش کش کی ہے۔ یہ مدارس بالعموم الگ تھلگ رہ کر کام کرتے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر اسکول ایجوکیشن مسٹر بالس نے یقین دلایا کہ زائد از 100 مسلم اسکولوں کو فنڈ فراہم کیے جائیں گے بشرطیکہ وہ سرکاری زیر انتظام اسکول بن جائیں۔ روزنامہ ڈیلی میل نے یہ اطلاع دی۔ برطانیہ میں 115 یا 116 آزاد مسلم اسکول ہیں جن میں 7 مسلم اسکول، سرکار کے زیر انتظام ہیں۔ مسٹر بالس نے بتایا کہ اسکولوں کو اسی وقت سرکاری انتظام میں لیا جاسکتا ہے جب مقامی کمیونٹی اس کی خواہش کرے۔ اس مقصد کیلیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔ حکومت کا استدلال ہے کہ نجی مذہبی اسکولوں کو سرکاری انتظام میں لانے کے نتیجے میں حکومت کو مسلم اسکولوں پر عظیم تر کنٹرول حاصل ہوجائے گا، دوسری جانب مخالفین نے کہا ہے کہ ایسے اقدام سے باہمی تفریق زور پکڑے گی۔ لبرل ڈیموکریٹس پارٹی کے ایم پی ڈاکٹر ایون ہیریس نے کہا ہے کہ مختلف مذاہب یا عقائد کے اسکولوں کے سبب موجودہ نسلی تفریق اور بھی شدید ہوجائے گی اور جب سوشیل کلاس کے لیے طلبہ کو یکجا کیا جائے گا تو اس کے نتائج، کمیونٹی اسکولوں کے نتائج سے بہتر نہیں ہوں گے۔ تاہم برطانیہ میں ایسوسی ایشن آف مسلم اسکولس کے صدر نشین ڈاکٹر محمد مقدم نے کہا ہے کہ مسلم فرقے کی جانب سے سرکاری دینی مدرسوں کے لیے مطالبہ تو کیا گیا ہے لیکن اس کو آگے بڑھانے میں کچھ وقت لگے گا، جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا ہم اس رجحان میں اضافہ پائیں گے۔ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ انگلینڈ کے 21 ہزار سرکاری اسکولوں کی ایک تہائی تعداد مختلف عقائد کے اسکولوں کی ہے۔ ان میں غالب اکثریت انگلیکن یا کیتھولک اسکولوں کی ہے۔ ایک یونانی آرتھوڈکس، ایک سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ، دو سکھ، 7 مسلم اور 37 یہودی اسکول ہیں۔

(منصف، حیدرآباد)

چھتیس گڑھ اردو اکادمی کی خبریں

● چھتیس گڑھ میں ایک ریاست تھی رائے گڑھ جو اب ایک ضلع ہے۔ وہاں کے راجا چکر دھر سنگھ موسیقی و رقص کے بہت دلدادہ تھے اور اپنے زمانے میں موسیقی اور رقص کا ایک سالانہ جلسہ منعقد کرتے تھے۔ اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے حکومت اور نجی اداروں کے تعاون سے ہر سال ایک سمارو ہ منایا جاتا ہے جو ایک ہفتے تک چلتا ہے۔ اس میں ملک کے نام ور رقاص اور موسیقار نیز ڈرامہ نویس شرکت کرتے ہیں۔ مشاعرہ بھی ہوتا ہے، جس میں ملک کے نام ور شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے، امسال یہ پروگرام اس ماہ رائے گڑھ میں منعقد ہوا اور اس میں ممبئی، لکھنؤ، بھوپال اور رائے پور کے فنکاروں نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے وائس چیئرمین جناب اعجاز بیگ مہمان خاص تھے۔

● اردو اکادمی چھتیس گڑھ نے امسال ایک سہ ماہی رسالہ ''نگاہ ادب'' شائع کیا ہے سرورق میں تاج محل کی تصویر ہے۔ اس میں مقامی قلمکاروں کے مضامین نثر و نظم کی شمولیت کو اولیت دی گئی ہے۔ اس کا اجرا ڈاکٹر رمن سنگھ وزیر اعلیٰ چھتیس گڑھ نے کیا۔

● چھتیس گڑھ میں اردو اساتذہ کی قریب 445 اسامیاں نکلی تھیں جن کی نشاندہی اردو اکادمی کر چکی ہے مگر ابھی تک تقرر کی کاروائی نہیں ہوئی اس سلسلے میں الپ سنکھیک آیوگ اور مدرسہ بورڈ کو حکومت پر زور ڈالنا چاہیے۔

● چھتیس گڑھ اردو اکادمی میں سکریٹری کے عہدے پر جناب امتیاز احمد انصاری ایم اے اردو کی تقرری ہوئی ہے۔

● رائے پور کی روی شنکر یونیورسٹی اور اس سے ملحق کسی بھی کالج میں اردو کی پڑھائی کا انتظام نہیں ہے اس کے متعلق رجسٹرار اور دیگر متعلقہ افسروں سے جو جانکاری ملی وہ بڑی افسوس ناک ہے۔ ان کا کہنا ہے ہم اردو شروع کر سکتے ہیں۔ پہلے بھی اردو کی کلاسیں تھیں اور اردو میں ایم اے کا انتظام تھا مگر اب طالب علم ہی نہیں آتے تو ہم کیا کریں۔ اس سلسلے میں لوگوں تک یہ پیغام پہنچانا ضروری ہے کہ وہ اردو کو قائم رکھنے کے لیے اردو طالب علم مہیا کروائیں۔

(ڈاک سے)

اردو ڈراما ''یہ کس کا لہو ہے!'' کے کامیاب 41 شوز

● یہ ڈراما ممبئی لوکل میں ہونے والے مسلسل بم دھماکوں کی ایک خوف ناک لرزہ خیز داستان پیش کرتا ہے جس کے اب تک ممبئی اور مہاراشٹر بھر میں 41 کامیاب شو ہو چکے ہیں۔ اردو کے معروف ڈراما نگار اور ہدایت کار اقبال نیازی نے یہ تین ڈرامائی مونولاگ تحریر کیے ہیں اور انھیں ہدایت سے بھی سجایا ہے۔ جبکہ دیپیکھا دیشکھ، شیتل بنکر، اور مظہر شیخ کی متاثر کن جذباتی اداکاری سے سوا گھنٹے تک ناظرین سحرزدہ سے ڈرامے میں کھوئے رہتے ہیں۔

گذشتہ دنوں اس سانحے کی پہلی برسی پر ممبئی کے میسور آڈیٹوریم میں شہر کی سرکردہ ہستیوں نے اس ڈرامے کو دیکھا اور سراہا۔ 2 اکتوبر کو گاندھی جینتی کے موقع پر سہارن فار پیس ممبئی کے عظیم الشان امن میلے میں بھی سینکڑوں ڈراموں میں سے اس ڈرامے کا انتخاب عمل میں آیا۔ انگریزی اور ہندی اخبارات نے اپنے تبصروں میں اسے غیر معمولی اور بامقصد ڈرامائی پیشکش قرار دیا۔ مصنف و ہدایت کار اقبال نیازی نے کہا کہ یہ تین ڈرامائی مونولاگ دراصل وہ مرہم ہیں جو ہم اس سانحے کے شکار لوگوں کے زخموں پر رکھ رہے ہیں اور اس طرح کے ڈرامے ہمارے عہد کی اہم ضرورت ہیں۔ فاشسزم، بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی سے لڑنے کے لیے محض تقریروں اور مضامین کا ڈھیر لگا دینے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس قسم کے ڈراموں کے ذریعے عام لوگوں کے درمیان جا کر، ان کی زبان میں، ان کے مسائل پر بات کرنا ضروری ہے۔ تفریح کے ساتھ مقصدیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے پھر دیکھیے آپ کی بات کتنے موثر ڈھنگ سے لوگوں کے دلوں تک پہنچتی ہے۔

''یہ کس کا لہو ہے! کون مرا'' میں تین کردار ایک مسلم نوجوان بچو مستری، ایک مہاراشٹرین لڑکی سنگیتا راجن کھولے اور ایک گجراتی متوسط طبقے کے آدمی من سکھ پٹیل کی آتما، ناظرین کو اپنی کہانیاں دلچسپ انداز میں سناتے ہیں۔ وہ اسٹیج پر ہنستے بھی ہیں، ناچتے بھی ہیں، اچھل کود بھی کرتے ہیں، روتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں۔ تینوں آرٹسٹ اسٹیج پر تقریباً 35 کردار نبھاتے ہیں اور من جملہ 15 مختلف مقامات کو منچ پر بتایا گیا ہے۔ رفیق دستا کے لکھے گیتوں اور موسیقی سے اور ٹرین کے گذرنے کی آواز سے تینوں مونولاگس کو جوڑا گیا ہے اور علامتی طور پر ایک منطقی انداز سے تینوں مونولاگس کو ایک سلسلہ وار کہانی بنا دیا گیا ہے۔ اقبال نیازی اسے تجارتی انداز سے نہ کرتے ہوئے نہایت معمولی خرچ پر بلکہ کہیں کہیں اس کے بالکل مفت شو اسکول اور کالجوں میں کر رہے ہیں اور اپنے مثبت پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں، ان کی اس کوشش کو ہر جگہ سراہا جا رہا ہے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● پریس کلب آف انڈیا نئی دہلی نے 5 ستمبر کو ڈاکٹر کرن کاشمیری کے شعری مجموعے ''شہر گل، شہر خموشاں'' کے اجرا کا اہتمام کیا۔ مجموعۂ کلام کی رونمائی جناب بلراج کومل نے پروفیسر سیف الدین سوز، مرکزی وزیر آبی

وسائل کی صدارت میں منعقدہ تقریب میں کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر علی جاوید مہمان خصوصی تھے۔ جناب سیف الدین سوز نے کہا کہ بہت سے لوگ صاحب علم اور صاحب فکر ہوتے ہیں لیکن قلم اٹھاتے ہوئے انھیں پس و پیش ہوتا ہے۔ کرن کاشمیری صاحب علم، صاحب فہم و ذکا ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی زبان کی طرح اردو بھی کسی مخصوص فرقے کی زبان نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک خاص سازش کے تحت اردو زبان کو ایک خاص فرقے یعنی مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو غیر مناسب ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسکھان سے بڑا ہندی کا کوئی شاعر نہیں اور وہ مسلمان تھے۔ اسی طرح نظیر اکبرآبادی نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندو تہواروں اور ثقافت پر جتنی نظمیں لکھی ہیں اتنی کسی ہندو شاعر نے نہیں لکھیں۔ انھوں نے اردو کو قومی یگانگت اور محبت کی زبان بتایا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ادیب یا شاعر صرف ادیب یا شاعر ہوتا ہے۔ ہندو یا مسلمان نہیں۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے، جس کی ہم سب کو قدر کرنی چاہیے۔

بلراج کومل نے کرن کشمیری کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کے کئی رخ ہیں۔ انھوں نے مقامی اور ہنگامی موضوعات پر بھی لکھا ہے اور ستم ہائے روزگار پر بھی۔ انھوں نے رومانی شاعری بھی کی ہے لیکن ان کی رومانیت، سطحی نہیں۔

اشہر ہاشمی نے کرن کشمیری کی شاعری پر ایک مقالہ پیش کیا۔ رسم اجرا کی تقریب کی نظامت پریس کلب آف انڈیا کے چیئرمین جناب راہل جلالی نے بڑی خوش اسلوبی سے کی۔ (ہفت روزہ ''تیج'' نئی دہلی)

● ٹورانٹو، ٹورانٹو کے گجراتی ادبی فورم بزم وفا، اور AFMI کے تلے عالمی شہرت یافتہ جدیدیت کے علمبردار شاعر عادل منصوری کا جشن منایا گیا، جس میں انگلینڈ اور امریکہ کے مشہور شعرا نے شرکت کی۔ اس جشن اور عالمی مشاعرے کی صدارت جناب تسلیم الٰہی نے فرمائی۔

پروگرام کے آغاز میں رشیدہ رحمانی نے صاحب جشن عادل منصوری کے لیے استقبالیہ کلمات کہے اور AFMI بزم وفا کے لیے اس جشن اور مشاعرہ کے انعقاد کو ایک اعزاز قرار دیا۔ ان کے بعد محمد علی وفا نے عادل منصوری کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ اور صاحب صدر تسلیم الٰہی زلفی کو گجراتی فورم میں خوش آمدید کہا۔ عابد علی نے عادل منصوری کے حوالے سے تفصیلی پیپر پڑھا۔ اور ان کی گجراتی شاعری سے منتخب اشعار سنا کر تمام حاضرین محفل کے دلوں کو گرما دیا۔ صاحب جشن عادل منصوری نے اپنے خطاب میں AFMI اور بزم وفا سے اظہار ممنونیت کیا اور اپنے شعری سفر کے حوالے سے گفتگو کی۔ پھر اہل محفل کے اصرار پر اپنا گجراتی کلام بھی سنایا۔ ان کے بعد زلفی صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں جناب عادل منصوری کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ عادل منصوری کی مادری زبان لاکھ گجراتی سہی لیکن بلا مبالغہ وہ ہمارے عہد میں اردو شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری کے ممتاز ترین شعرا کی صنف میں شامل ہیں۔ عادل منصوری چاہتے ہیں کہ آج کا ہر فنکار عقل اور دل کا فاصلہ بڑھنے نہ دے بلکہ انھیں قریب لانے کی کوشش کرے اور ضمیر انساں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انسانی اخلاق کی لو کو بجھنے نہ دے۔ تسلیم الٰہی زلفی کے صدارتی کلمات کے بعد پروگرام کے دوسرے حصے میں محفل مشاعرہ ہوئی۔ جس کی نظامت عابد علی نے کی۔ اس موقع پر جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش فرمایا ان کے اسمائے گرامی احمد گل (انگلینڈ) بسمل منصوری (عادل منصوری (امریکا) اور صاحب صدر تسلیم الٰہی زلفی (ٹورانٹو)، تقریباً دو سو باذوق اور باعلم افراد کی شرکت نے اس جشن اور مشاعرے کو چار چاند لگا دیے۔

● اندور، سہ ماہی ''موگاں'' کے مدیر نوشاد مومن کو اردو شاعری میں ان کی خدمات کے اعتراف میں روپاکن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ 21ہزار روپے نقد، سند اور سپاس نامے پر مشتمل یہ ایوارڈ انھیں یہاں ایک ادبی تقریب میں دیا گیا جس میں ہندی صحافت کے لیے این ڈی ٹی وی کے کمار سنجے سنگھ کو بھی بھروسہ نیاس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ معروف اردو شاعر منور رانا کی دیوناگری رسم خط میں نئی کتاب ''پھر کبیر'' کے اجرا اور ہند پاک دوستی معاشرہ کی اس تقریب کا اہتمام بھروسہ نیاس اور روپاکن جیسے فلاحی اور سماجی اداروں نے کیا تھا۔ ''پھر کبیر'' کا اجرا سوامی اگنی ویش اور پارلیمانی رکن ستیہ برت چترویدی نے کیا۔ رکن اسمبلی آنند پیاسی مہمان خصوصی تھے۔ مہیش جوشی اور لکشمی شرما نے بھی اظہار خیال کیا۔ ہند پاک دوستی مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر ستیہ نارائن جٹیا نے کی۔ ندا فاضلی، منور رانا راحت اندوری کے علاوہ پاکستان سے ریحانہ روحی، رخسانہ نازی، افغانستان سے راہ بین خورشید اور ایوارڈ یافتہ شاعر نوشاد مومن نیز دیگر مقامی غیر مقامی شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

● غریب نواز ایجوکیشن سوسائٹی، رائے پور (چھتیس گڑھ) کے زیر اہتمام 12 اگست 2007 صوبے کے ہونہار طلبہ و طالبات کا اعزاز کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی تھے۔ صدارت جناب محمود علی فاروقی ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ سیشن جج رائے پور نے کی۔ اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ہمیں تعلیم پر خاص توجہ دینی چاہیے، تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان کی ایک الگ پہچان قائم ہوتی ہے اور جو ہر مقام پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

پروگرام میں چھتیس گڑھ کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تقریباً 575 طلبہ و طالبات نے حصہ لیا جنھیں کمیٹی کی جانب سے سرٹیفکیٹ اور انعامات دیے گئے۔ اس موقع پر کمیٹی کے سکریٹری اکبر علی فاروقی نے کمیٹی کے ذریعے کیے جارہے کاموں جیسے تعلیمی سروے، غریبوں کو تعلیمی امداد اور دیگر فلاحی کاموں کی جانکاری دی۔ یہ سوسائٹی تقریباً 17 سال سے تعلیم کے میدان میں کام کررہی ہے جس کے ذریعے کئی اسکول، کالج چلائے جارہے ہیں۔ اقبال شریف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں مولانا ظہیر الدین رہبر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 10 ستمبر۔ ہندوستان ایکسپریس نیوز بیورو: راجدھانی دہلی کے علاقہ بلیماران میں سوشل اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام مخدوم زادہ مختار عثمانی (مرحوم) کی پہلی برسی پر ان کی یاد میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت دہلی اردو اکادمی کے ممبر ریاضت علی شائق او رنظامت درد دہلوی نے کی۔ مرحوم کے قریبی دوست اورنشست کے کنوینر سید طاہر علی بھارتی نے مرحوم کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مخدوم زادہ مختار عثمانی ایک ایسی ادبی شخصیت تھے جو شعروادب کی ہر انجمن میں جانے جاتے تھے۔ ایک سادہ زندگی گزارنے والے مخدوم زادہ عثمانی جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے سفیر شعروسخن تھے۔ دلکش کاشفی کی حمد باری اور نعت شریف سے نشست کا آغاز کیا گیا، درج ذیل شعرا نے بھی کلام سنایا: ریاضت علی شائق، جمال حسن پوری، ماسٹر نثار احمد، درد دہلوی، سید طاہر بھارتی، نثار دہلوی، واقف دہلوی، واحد دہلوی۔ نشست کے اختتام پر مرحوم کے لیے اجتماعی دعا کی گئی اور قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کرکے ایصال ثواب بھی کیا گیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● نئی دہلی، 10 ستمبر۔ آزاد اسٹڈیز سرکل کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں مخدوم زادہ مختار عثمانی کی پہلی برسی کے موقع پر ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کانگریس کے لیڈر حاجی میاں فیاض الدین نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شہباز ندیم ضیائی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے عتیق صدیقی نے کہا کہ مختار عثمانی ایک خوش اخلاق اور منکسر مزاج شخص تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت میں بسر کی۔ حاجی میاں فیاض الدین نے کہا کہ مخدوم زادہ مختار عثمانی پرانی دلی کی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال تھے اور ان میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مشاعرے کے آغاز میں قاضی ابرار کرتپوری نے حمد اور ڈاکٹر تابش مہدی نے ہدیہ نعت پیش کیا۔ مندرجہ ذیل شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ ڈاکٹر گلزار دہلوی، وقار مانوی، نصرت گوالیاری، ڈاکٹر تابش مہدی، ابرار کرتپوری، شہباز ندیم ضیائی، رؤف رضا، شمس رمزی، انور باری، اقبال اشہر، سید راشد حامدی، صالحین فہمی، رؤف رامش، جاوید مشیری۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 11 ستمبر۔ ہندوستان ایکسپریس نیوز بیورو: دہلی کی قدیم ادبی تنظیم، حلقہ تشنگان ادب'' کی 396 ویں شعری نشست صدر بازار، دہلی کینٹ میں منعقد کی گئی۔ نشست کی صدارت حلقہ کے صدر جی آر کنول نے کی اور نظامت کی ذمے داری سیماب سلطان پوری نے انجام دی۔ حسب ذیل شعرا نے کلام پڑھا۔ نوشاد دہلوی، موہن سنگھ بیدی، ڈاکٹر راحت مظاہری، دیوندر سنگھ مانجھی، شہادت علی نظامی، پریم سنگھ نسیم، درد دہلوی، عاصم کرت پوری، آذر سنگھ کوہلی، ریاضت علی شائق، سریندر سنگھ شجر، سیماب سلطان پوری، رمیش سدھارتھ اور اشوک ورما۔ حلقہ تشنگان ادب ایک ایسی ادبی تنظیم ہے جس میں اردو، ہندی اور پنجابی تینوں اہم زبانوں کے شعرا شریک ہوتے ہیں۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● متھرا، 13 ستمبر۔ بزم شہدائے ادب متھرا کے زیر اہتمام چھیاسٹھویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت حاجی امراؤ علی خاں انس پرتاپ گڑھی نے کی۔ نظامت سید محمد حسین اختر نے کی اور مہمان خصوصی رام گوپال ڈائرکٹر آکاشوانی متھرا تھے۔ بانی بزم سعید اعظمی نے رام گوپال کو قرآن کریم کا ہندی نسخہ پیش کیا۔ بحیثیت مہمان ذی وقار قمر عالم کوآرڈینیٹر مسلم ریزرویشن فورم کا بھی بزم کی جانب سے استقبال کیا گیا۔ بیرونی شعرائے کرام کا گلپوشی سے استقبال کیا گیا۔ مشاعرے سے قبل سعید اعظمی نے قرۃ العین حیدر کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے بتایا کہ محترمہ اردو ادب کے ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتی تھیں جن کی تحریروں سے لاکھوں تشنگان اردو سیراب ہوا کرتے تھے۔ مرحومہ کے لیے ایصال ثواب کے بعد مصرع طرح '' آرزو اس کی عذاب جسم و جاں ہونے لگی'' پر شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا۔ شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

امراؤ علی خاں انس، بابو یٰسین خاں شفائی، حاجی شمیم متھراوی، سعید اعظمی، جالب سیفی، سید محمد حسین اختر، بشر صہبائی بھوپال، سید اثر ایوبی بجنور، سید مشرف حسین مضطر، نصرت شفائی اڑیسہ، تابش متھراوی، شہاب الدین راہی، ڈاکٹر سعید احمد سعید، جمیل رونق، محمد اشفاق ثمر، قمر اکبرآبادی بھساول، قمر حسن پوری، شکیل تلمیری، عالم اعظمی، حمید تلمیری، کرشن گوپال شکل پارس، صداق اعظمی، اسلام متھراوی، محمد صدیق راز۔ مشاعرے کے اختتام پر حاجی نظام الدین نے بھی مہمانان وشعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 12 ستمبر۔ باغ ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور اردو اکادمی دہلی کے مشترکہ تعاون سے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک مشاعرہ زیر صدارت الحاج عبدالسمیع سلمانی منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی شمع اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے روشن کی جبکہ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے افتتاح کی رسم ادا کی۔ ڈاکٹر زین العابدین اور محمد چاند نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر منصور احمد عثمانی اور ڈاکٹر حسین کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شعرا تھے:

سید جمال ہاشمی، انور باری، اقبال اشہر، سریش چندر، ڈاکٹر راحت مظاہری، شہباز ندیم ضیائی، اقبال فردوسی، مرغوب حیدر عابدی، شمس رمزی، سلیم کاشف۔ کچھ دیگر شعرا نے بھی اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔

(ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 12 ستمبر۔ ادبی تنظیم 'اردو کارواں' کے زیر اہتمام آزادی کی 60ویں سالگرہ کے موقع پر موج پور میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مولانا تنویر احمد اور نظامت ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر اسرار قریشی، محمد چاند، محمد عثمان فاروقی، زبیر قریشی اور آمنہ خاتون نے شرکت کی۔ نشست کا آغاز راشد علی شفا کی نعت سے ہوا جبکہ سیف سحری نے قومی ترانہ پیش کیا۔ نشست میں مندرجہ ذیل شعرا شریک تھے۔

نظمی سکندرآبادی، محمد احمد رمز، سیف سحری، اسرار قریشی، راشد علی شفا، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، سرویش چندوسوی، عقیل نہٹوری، ڈاکٹر امیر امروہوی، جگر نوگانوی، ہلال عباس امروہوی، عادل امروہوی۔

وفیات

مبارک شمیم

● اردو کے مشہور شاعر اور ادیب مبارک شمیم کا 26 ستمبر 2007 کی صبح چھ بجے حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے پچاسی سال عمر پائی تقریباً ساٹھ سال انھوں نے اردو شعروادب کی خدمت اور نئی نسل کی تربیت میں گزارے۔ انھیں اپنے آبائی وطن شاہجہانپور سے بے حد محبت تھی ساری عمر وہیں بسر کی اور وہیں کی خاک ملی۔

پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

مرحوم، پروفیسر قمر رئیس کے بڑے بھائی تھے۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اتر پردیش کے چند منفرد غزل گو شعرا میں شمار ہوتے تھے مرحوم نے نصف درجن طبع شدہ کتب کا ادبی ورثہ چھوڑا ہے" سخنوران شاہجہانپور" ان کی تحقیقی کاوش کا ایسا نمونہ ہے جس میں صدیوں پرانے شاہجہانپور کے شعرا کا بھی ذکر ہے اور عصری فنکاروں کا تعارف اور کلام بھی شامل ہے۔ انھوں نے ایک تذکرہ "غیر مسلم شعرائے شاہ جہانپور" کے نام سے مرتب کیا۔ ان کے کلام کے چار مجموعے "نقش نوا"، "سواد جاں"، "آب وہوا" اور "پت جھڑ کے پھول" شائع ہوئے۔ ان کے شعری لہجے میں کلاسیکی دروبست اور جدید احساس فکر کی لطیف آمیزش ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم آبائی وطن میں اور اعلا تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ "مبارک شمیم: فن اور شخصیت" کے عنوان سے چند روز قبل ہی مرحوم کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایم آر پبلی کیشنز نے ایک کتاب شائع کی تھی۔ آندھرا پردیش اور بنگال اردو اکادمیوں سے ان کے دونوں شعری مجموعوں پر ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش اردو اکادمی کا "بیسٹ اردو ٹیچر" ایوارڈ بھی انھیں عطا کیا گیا۔ شاعری کے علاوہ تنقید پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ہم عصر جدید شعرا پر لکھے گئے ان کے تنقیدی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عبدالغنی دہلوی

● دہلی کے ممتاز ناشر عبدالغنی دہلوی (مالک ساقی بک ڈپو) کا 30 ستمبر 2007 بروز اتوار صبح پانچ بجے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 62 سال تھی اسی روز دوپہر تین بجے لودھی روڈ پر واقع قبرستان پنج پیران نزد درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں تدفین عمل میں آئی۔ جنازے میں اعزہ و اقارب کے علاوہ اردو، ہندی کے ادیب، شاعر، نقاد، صحافی اور اردو کے اساتذہ اور متعدد ناشرین اور تاجران کتب شریک تھے۔

ابتدا میں غنی دہلوی نے 1958 میں شہاب سیریز کے تحت متعدد رومانی ناول اور ایک جاسوسی ماہ نامہ شائع کیا۔ 1959 میں ایک مزاحیہ رسالہ ماہ نامہ "بکواس" بھی جاری کیا۔ بعد ازاں "نور یزداں" اسلامی ڈائجسٹ اور بچوں کے لیے پہلا "اردو کامکس" بھی شائع کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے احباب کے علمی ماہ ناموں اور اسپورٹس میگزین میں ادارتی فرائض بھی انجام دیے۔

عبدالغنی دہلوی نے ناظر سعید کے قلمی نام سے مضامین لکھے۔ جو ہندی، اردو جرائد میں شائع ہوئے۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے انھیں بہترین ناشر کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اقبال کرشن

● نئی دہلی، اردو کے شاعر اور صحافی اقبال کرشن کا پچھلے دنوں کولکاتا میں انتقال ہوگیا اقبال کرشن کی عمر 80 سال سے اوپر تھی۔ پسماندگان میں صرف

بیوہ ہیں۔ وہ لاولد تھے۔ کئی سال پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا مگر کسی حد تک چلنے پھرنے کے لائق ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے پھر ایک بار فالج کا حملہ ہوا تو صاحب فراش ہو گئے۔

اقبال کرشن کلکتہ کے جدید شاعروں میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ماہ نامہ "شب خون" الہ آباد کے لیے مسلسل لکھنے والے قلمکاروں میں شامل تھے۔ وہ شاعری کے علاوہ فکشن اور تنقید بھی لکھ رہے تھے۔ ان کا اصل نام سید محمد اقبال تھا۔ ان کے والد مرحوم سید عبدالرشید بھی شاعر تھے اور ارشد لکھنوی کے نام سے لکھتے تھے۔

مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کی لٹریری سب کمیٹی کے زیر اہتمام اقبال کرشن کے سوگ میں ایک تعزیتی جلسہ انجم عظیم آبادی کی صدارت میں ہوا۔ اصحاب الحسن، اشرف احمد جعفری، اقبال کرشن کے برادر نسبتی قاری محمد شفیق اور پروفیسر سلیمان خورشید نے اقبال کرشن کی حیات اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے صدر پروفیسر سلیمان خورشید نے کہا کہ اقبال کرشن کی دنیا بے زاری اور خود بیزاری کے پیچھے ان کے ساتھ سماج کا جارحانہ رویہ تھا، جس نے ان کے باغیانہ ذہن اور روایت شکنی کے رویے کا احترام نہیں کیا۔ اقبال کرشن انگریزی کے ایک ماہنامہ "راؤنڈ اباؤٹ" کے علاوہ بہت لمبے عرصے تک کلکتہ کے روزنامہ "آزاد ہند" سے وابستہ رہے۔ انھوں نے انگریزی سے آٹھ کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔

سلامت اللہ خان

● نئی دہلی، 12 ستمبر۔ معروف صحافی سلامت اللہ خان 10 ستمبر 2007 کو اس جہان فانی سے طویل علالت کے بعد کوچ کر گئے۔ مرحوم نے آل انڈیا ریڈیو اردو سروس میں تقریباً 40 سال تک مسلسل خدمت انجام دی۔ 1984 میں وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی زندگی کے آخری سال بیماری میں گزرے وہ بیماری کے باوجود بھی ہمیشہ حوصلہ مند رہے۔ وہ ان دنوں اپنی رہائش گاہ پٹودی ہاؤس دریا گنج میں قیام پذیر تھے۔ مرحوم کو پرانی قبرستان دہلی میں 11 ستمبر کی صبح سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

تعاون کی درخواست

● میں "کرناٹک میں اردو غزل" کے عنوان پر ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں، کرناٹک کے ذی وقار شعرائے کرام سے گذارش ہے کہ وہ اپنی کم از کم پانچ غزلیں اور مختصر حالات زندگی مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔ گذارش ہے کہ دیگر شعرا حضرات تک بھی یہ اطلاع پہنچا دیں، شکر گذار ہوں گا۔

سلیمان اطہر جاوید
9-4-134/11, Aruna Colony,
Toli Chowki, Hyderabad - 500008 (A.P.)

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

● **کلیات پریم چند— جلد چھ، سات، آٹھ، نو اور دس**

مرتبہ: مدن گوپال

جلد چھ (صفحات: 449، قیمت: -/157)، جلد سات (صفحات: 375، قیمت: -/132)، جلد آٹھ (صفحات: 515، قیمت: -/172)، جلد نو (صفحات: 598، قیمت -/134)، جلد دس (صفحات: 531، قیمت: -/183)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: لطف الرحمٰن، ایف-7، سپنا اپارٹمنٹ، نیا ٹولہ، پٹنہ (بہار)

زیر تبصرہ کلیات پریم چند کی پانچ جلدیں ناول اور افسانوں پر مشتمل ہیں، جلد (6)، جلد (7) اور جلد (8) ناولوں پر اور جلد (9) اور (10) افسانوں پر۔

جلد (6) میں ''نرملا'' اور ''غبن'' اور جلد (7) میں ''میدان عمل'' ہے۔ جلد (8) ''گئودان'' اور ''منگل سوتر'' پر مشتمل ہے— پریم چند کے مذکورہ پانچوں ناول نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو فکشن کا کوئی بھی مطالعہ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے بغیر معتبر نہیں ہوسکتا، اس لحاظ سے ان ناولوں کی یکجائی یقیناً قابل ستائش ہے۔

پریم چند کی انفرادیت ہندوستانی دیہی معاشرے اور خاص کر غریب طبقے کی زندگی کے مسائل و معاملات کی عکاسی پر مبنی ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات کی گہرائی، گیرائی اور ان کی پراثر پیش کش اور کرداروں کے ذہنی اور باطنی رویے ایک دوسرے سے مربوط ہوکر پریم چند کی فنکارانہ تہہ داری اور عظمت کی توثیق کرتے ہیں۔ پریم چند کی نگاہ میں جابرانہ اور استیصالی سماجی نظام ہمیشہ اسی طرح رہا جس طرح بان چلاتے وقت ارجن کی نگاہ میں مچھلی کی صرف آنکھ رہی تھی۔ ان ناولوں میں جذباتی وجود کی نزاکتوں، آشفتگیوں مکتوں اور ان کو سہہ لینے کی کیفیتوں کو پریم چند نے جس طرح آئینہ کیا ہے، انھیں کا حصہ ہے۔

پریم چند حقیقت پسندی کے علم بردار تھے۔ ان کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کی نئی کروٹوں کا زمانہ تھا۔ مارکسی اثرات کے تحت طبقاتی کشمکش [illegible] ناہمواریوں کو دانشور اور حساس طبقہ تیزی سے اپنی گرفت [illegible] ہے۔ سامراجی تسلط اور ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کی فضا بہت پہلے سے تیار ہورہی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی اپنی ناکامی کے باوجود حساس ذہنوں میں غلامی اور استیصال کے خلاف لہریں پیدا کرچکی تھی۔ عوامی سطح پر قومی بیداری تیز تر ہورہی تھی۔ قمر رئیس اپنے مضمون ''جدید اردو ناول میں'' رقم طراز ہیں— ''پریم چند نے بھی Indian Social Reform Series کے تحت جو ناول لکھے وہ ہندو قوم اور ہندوستانی معاشرت کی اصلاح کے جوش اور ولولے سے معمور ہیں۔ 1920 میں پریم چند کا ناول گوشہ عافیت مکمل ہوا۔ یہاں سے اردو ناول کے ایک نئے موڑ اور نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔۔۔ جیسے جیسے پامال طبقوں سے ان کی ہم دردی گہری ہوتی گئی، فن پر ان کی گرفت بڑھتی گئی۔۔۔ ان کی تخلیقی قوت ان کے آدرشوں سے زیادہ سماجی اور تہذیبی حقائق پر اعتماد کرنے لگی، ان کے کردار زیادہ تہہ دار، دلچسپ اور مکمل ہوتے گئے۔'' پریم چند کے مذکورہ پانچوں ناول قمر رئیس کی تائید کرتے ہیں۔

پریم چند نے ہندو معاشرے کے منفی رسوم کی اصلاح کی جو کوشش کی اس کی نمائندہ مثال ''نرملا'' ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کے سلسلے میں عجیب وغریب تضادات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو انھیں درگا اور سرسوتی کہا جاتا ہے اور بہو کو گھر کی لکشمی کہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ مردوں کی محکوم نظر آتی ہیں۔ پریم چند کی ''نرملا'' ہو کہ سرت چندر چٹرجی کی پارو ہندو معاشرے نے دونوں کو زندگی کا المیہ ہی دیا۔

''میدان عمل'' ہندی میں 1932 میں شائع ہوا تھا۔ اردو میں کئی برسوں کے بعد آیا۔ یہ زمانہ سیاسی بے چینی کا تھا۔ آزادی کی لہر اپنے عروج پر تھی۔ ''میدان عمل'' میں پریم چند کا جذبۂ آزادی بھی اپنے کلائمکس پر نظر آتا ہے۔ ایک ہندو خاندان کے وسیلے سے اس ناول میں سیاسی تگ و دو کی عکاسی بخوبی کی گئی ہے۔ ''نرملا'' ماہ نامہ ''چاند'' میں نومبر 1925 سے نومبر 1926 تک مسلسل قسط وار شائع ہوتا رہا۔ جنوری 1927 میں چاند پریس نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ پریم چند نے خود ہی اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ پریم چند کا ایک ناول ''کشنا'' بھی آیا تھا جس کے مرکزی خیال کی بنیاد پر یعنی خواتین کا زیورات سے لگاؤ ''غبن'' کی تصنیف ہوئی۔ یہ سب ابتدائی دور کی تصنیفات ہیں۔ پریم چند کے فن اور ذہن کو سمجھنے کے لیے یہ ناول بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے کافی عرصہ پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا— ''پریم چند ایک ادیب تھے، میرے نزدیک ایک عظیم ادیب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی دھڑکن بن جائے۔ زمانے کی نبض اور زندگی کا تنقیدی آئینہ بن جائے۔ اسی طرح عظیم ادب وہ ہے جو اپنے عہد اور زمانے کی حسیاتی دستاویز بن جائے۔ پریم چند کے جمالیاتی تجربوں کی قربت نے مجھے بارہا یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان میں ایک عظیم ادیب کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں (نقد نگاہ ص 57-156) اپنے اسی مضمون میں، میں نے ''میدان عمل'' کے حوالے سے یہ چند جملے رقم کیے تھے جو میرے خیال سے پریم چند کے اس ناول کو سمجھنے

میں معاون ہو سکتے ہیں — "میدان عمل" 1932 کی تصنیف ہے۔ اس ناول میں پریم چند کے یہاں انقلابی ذہن وفکر کی ترجمانی ملتی ہے۔ سماجی اصلاح کے جذبے پر بغاوت اور انقلاب کا جوش وخروش حاوی ہوتا ہے۔ طبقاتی کشمکش اور مزدوروں کی بیداری نے اس ناول میں جگہ پائی ہے۔ وہ خود بھی اس عہد کی سیاسی زندگی میں کسی حد تک عملاً شامل رہے ہیں۔ ان کی بیوی شورانی دیوی جیل کی سزا کاٹ چکی ہیں۔ وہ سماجی اور معاشرتی زندگی اور سیاسی پیچ وخم کا معتبر اور واضح شعور حاصل کر چکے تھے جس کا ثبوت اس ناول میں کسانوں اور مزدوروں کی زبوں حالی وبدنصیبی ہے" (ایضاً ص166)

"گئودان" پریم چند کا آخری ناول ہے۔ اس کا سن تصنیف 1935 ہے۔ لیکن اس کی اشاعت 1936 میں ہوئی۔ اردو میں یہ ناول پریم چند کی وفات کے ایک سال بعد شائع ہوا۔ "گئودان" اور "منگل سوتر" میں پریم چند نے معاشی آزادی کے لیے عملی جدوجہد کی راہ دکھائی ہے۔ سرمایہ دارانہ استیصال کے خلاف بغاوت کا جذبہ وجوش شباب پر ہے۔ "دھنیا" اور "گوبر" جس کی نمائندہ علامتیں ہیں۔

پریم چند کی تخلیقات میں ابتدا ہی سے ایک ترقی پسند ذہن کارفرما ہے۔ اردو میں انھوں نے سب سے پہلے مزاحمتی ادب کی تخلیق کی۔ جو اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ بنیادی طور پر وہ بائیں بازو کا ذہن رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ذہنی وفکری طور پر ترقی پسند تھے ضرور لیکن اشتراکی نہ تھے۔ اس کا اعلان نہ کبھی انھوں نے اپنے قلم سے کیا اور نہ ان کی تخلیقات سے ایسا ترشح ہوا۔

"گئودان" پریم چند کے جمالیاتی ادراک وضمیر کا بھرپور ترجمان ہے اور اپنے عہد کی ہندوستانی زندگی اور سماج کی ایک متحرک دستاویز۔ "منگل سوتر" ان کا ادھورا ناول ہے۔ اور بڑی حد تک سوانحی زندگی کا خاکہ ہے۔ نامکمل ہونے کی وجہ سے اس کے متعلق کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہے۔ لیکن اس ناول کا یہ جملہ پریم چند کے افکار وخیالات اور تخلیقی ضمیر کی آئینہ داری کرتا ہے۔

"درندوں کے بیچ ان سے لڑنے کے لیے ہمیں ہتھیار باندھنا پڑے گا۔۔۔ ان کے پنجوں کا شکار بننا دیوتا پن نہیں بزدلی ہے۔"

پریم چند کی ناول نگاری کی نمائندگی، "نرملا"، "میدان عمل"، "گئودان" اور "منگل سوتر" سے مکمل طور پر ہوجاتی ہے۔ کلیات پریم چند میں نمبر ایک سے نمبر آٹھ تک سارے ناول شامل ہیں اس طرح ان کو محفوظ دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ جہاں تک "منگل سوتر" کا سوال ہے، اس کا اردو ترجمہ سامنے آنا چاہیے محض اردو رسم الخط میں اسے منتقل کردینا کافی نہیں۔ یا تو یہ جلدبازی کا نتیجہ ہے یا پھر ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ۔ ناول کا اردو ترجمہ سامنے آنا چاہیے۔

پریم چند کی کئی اہم کہانیاں عالمی کلاسک میں شمار کی جاتی ہیں — پریم چند نے کسی ادّعا کے بغیر اپنی کہانیوں میں ان مسائل کو خلوص اور انسانی دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے جن کو ان کے بعد کی نسل کے شاطر لوگوں نے مختلف تحریکات اور مکاتب فکر کا لیبل لگا کر پیش کیا۔ مثلاً مابعد جدیدیت اور تانیثی تحریک وغیرہ کے تحت جن مسائل کو خصوصی توجہ کے قابل سمجھا گیا، ان پر پریم چند بہت پہلے کامیاب کہانیاں قلم بند کرچکے تھے۔ دلتوں کے مسائل، زوال انسانیت اور لاشخصیت ولافردیت کے احساس وتجربے پر پریم چند نے عصری سماجی اور معاشرتی تناظر میں اہم کہانیاں لکھی ہیں۔ پریم چند سیکولر ذہن کے انسان تھے اور چونکہ دانشورانہ سطح پر وہ ملحد (Non-Believer) تھے، اس لیے ان کے یہاں مذہبی تعصب وتنگ نظری کی فضا نہیں ملتی۔ ان کی کہانیوں میں مذہبی رسوم وروایات اور ظاہرداری پر گہرا طنز اس رجحان کا ثبوت ہے۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی کے نام اپنے خط مورخہ ایک دسمبر 1935 میں لکھتے ہیں۔

"میں دوسری دنیا پر یقین نہیں رکھتا۔ اس لیے عقبیٰ کی فکر سے محفوظ ہوں جو کہ واقعتاً جوانی کی سب سے بڑی قاتل ہے۔"

پریم چند کی نمائندہ کہانیوں میں "صرف ایک آواز"، "خون سفید"، "نجات"، "دودھ کی قیمت"، "پنہاری کا کنواں"، "زیور کا ڈبہ"، "دوبیل"، "نمک کا داروغہ"، "نئی بیوی"، "ادیب کی عزت"، "زادراہ"، "موٹے رام شاستری"، "منتر"، "نیچ ذات کی لڑکی"، "حج اکبر"، "تہذیب کا راز"، "عید گاہ"، "بڑے گھر کی بیٹی" اور "کفن" وغیرہ ہیں جن میں پریم چند کا تخلیقی باطن پوری طرح منور ہے۔ ان کی کہانیوں میں نئے سماج اور معاشرے کی تشکیل کی آرزومندی ملتی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سماجی اور معاشرتی اصلاح کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں سیاسی آزادی خود غرضی اور بے معنی کے ہم معنی ہوکر رہ جائے گی، وقت نے ثابت کیا کہ پریم چند کا خدشہ بہت صحیح تھا۔ اس لیے آج اس امر کی زیادہ ضرورت ہے کہ ان کی نمائندہ کہانیوں کو اردو کے قارئین تک پہنچایا جائے۔ لیکن اس کے لیے سخت انتخاب ناگزیر ہے۔ خود پریم چند کے لفظوں میں۔

"میری شائع شدہ کہانیوں کی تعداد تقریباً تین صد کے لگ بھگ ہے۔ ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لیکن آج کل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ان سب کو پڑھ سکے۔ اگر ہم ہر مصنف کی ہر چیز پڑھنا شروع کردیں تو شاید مشکل سے پانچ سات مصنف ہی ہماری زندگی میں ختم ہوسکیں۔ اس لیے میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کرکے چھاپوں، جس سے پڑھنے والے کو میرا فنی معیار اور رجحان معلوم کرنے میں سہولت رہے۔ جس کے مطالعے سے لوگ زندگی کے متعلق میرے

نظریات معلوم کر سکیں۔''

(کلیات پریم چند (9) ص26)

قومی اردو کونسل کی طرف سے پریم چند کے کلیات کی اشاعت قابل تحسین اقدام ہے۔ میرے پیش نظر ان کے کلیات کی (6,7,8,9,10) پانچ جلدیں ہیں جن کی روشنی میں یہ معروضات پیش کی گئیں۔

● **کلیاتِ میر (جلد دوم)**

تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر احمد محفوظ، زیرِ نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 632، قیمت: -/410 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: نجمہ رحمانی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی- 110007

میر بلاشبہ اردو کے بڑے شاعر ہیں۔ صنفِ شاعری میں ان کی اولیت پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن یہ اولیت عموماً ان کی غزل کے حوالے سے تسلیم کی جاتی ہے حالانکہ میر نے شاعری کی کم و بیش تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی افتادِ طبع نیز عام قاری کے شاعرانہ ذوق کے پیشِ نظر یہ شہرہ صرف غزل تک ہی محدود رہا۔ بہت ہوا تو ان کی مثنویات کو اس ضمن میں رکھ دیا گیا جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میر کا مشاہدہ اور اس مشاہدے کا حاصل خلاقانہ سطح پر ان کی دیگر تخلیقات میں بھی اسی ارفع درجے پر نظر آتا ہے لفظوں کے استعمال اور ان کی معنوی کثیر جہتی نے کلامِ میر کو کائنات کا آئینہ خانہ بنا دیا ہے۔ کلامِ میر کی ان نیرنگیوں کے پیشِ نظر ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے کلام کا ایک ایسا مکمل مجموعہ پیش کیا جا سکے جو حتی الامکان اغلاط سے پاک ہو۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کلیاتِ میر کو نئی ترتیب کے ساتھ از سرِ نو شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقیع کام کی ذمہ داری پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں ڈاکٹر احمد محفوظ کے سپرد کی گئی۔ ظلِ عباس عباسی کی مرتب کی ہوئی کلیات کی پہلی جلد مع تصحیح و اضافے کے 2003 میں کونسل سے شائع ہو کر قارئین تک پہنچ چکی ہے، جو میر کے چھ مکمل دواوین پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی کلیاتِ میر کی جلد دوم ہے جس میں میر کی غزلوں کو چھوڑ کر ان کا بقیہ کلام مثلاً قصیدہ مثنوی، مرثیہ، وغیرہ شامل ہیں۔ [illegible] 17 عنوانات قائم کر کے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ کے علاوہ خود نوشت، مخمسات، ہجویات، واسوخت، سلام، رباعی، قطعے، تضمین، وغیرہ تمام اصنافِ شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قارئین و طلبہ کی مزید سہولت کے پیشِ نظر جہاں جہاں ضروری سمجھا گیا، ذیلی عنوانات قائم کر کے موضوعات کی مزید صراحت کر دی گئی ہے۔

کلیات کی اس دوسری جلد میں ڈاکٹر احمد محفوظ کا 32 صفحات پر مشتمل ایک طویل دیباچہ نیز شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک مضمون ''میر صاحب کا زندہ عجائب گھر، کچھ تعجب نہیں خدائی ہے'' بھی شامل ہے۔

دیباچے میں نہایت صراحت کے ساتھ کلیات کی تدوین کے دوران پیش آنے والی تمام مشکلات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان نکات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے جنھیں تدوین کے لیے پیشِ نظر رکھا گیا۔

اشعار کی صحت کے سلسلے میں ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کے مخطوطۂ دیوانِ میر مکتوبہ 1192 ہجری (1778) نیز Oriental Manuscript Library and Research Institute سے دستیاب ایک قلمی نسخے، ''دریائے عشق''، ''شعلۂ عشق'' کے ایک قدیم مخطوطے (جو میر کی وفات سے قبل لکھا گیا) کے علاوہ مزید آٹھ مجموعوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ جن کی تفصیل کلیات کے دیباچے میں شامل ہے۔ کلام کی ترتیب کے لیے کسی ایک نسخے کو بنیاد بنانے کے بجائے اس کو از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ترتیب زیادہ سہل ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:

''دیگر تمام نسخوں میں ترتیب کلام کا اصول دکھائی نہیں دیتا۔ کسی نسخے میں کچھ کلام صنف کی بنیاد پر شامل ہے اور کچھ کلام کی خانہ بندی ہیئت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ مختلف اصناف کی ترتیب کسی بھی نسخے میں اطمینان بخش معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ یہاں تمام کلام کو صنف کی بنیاد پر ہی خانوں میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ مختلف اصناف کی ترتیب بھی نئے سرے سے قائم کی گئی ہے۔''

متن کی صحت کے سلسلے میں الفاظ معنی و املا کے تعین کے لیے اردو فارسی کی تقریباً 24 فرہنگوں اور لغات کے علاوہ قلمی نسخوں کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ جہاں ان سے مدد نہ مل سکی وہاں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس قیاس کے لیے بھی جواز فراہم کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قصیدے کا یہ شعر:

عزتیکہ ہے دوری راہ اس میں رفیق
منزلیکہ پہنچنا وہاں قیامت ہے

اس شعر کی قیاسی تصحیح کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں شعر کے مفہوم کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ لفظ ''عزت'' کو ''غربت'' سے بدل دینے کے بعد جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ زیادہ درست ہے کیونکہ راہ اور منزل غربت یعنی مسافرت سے مناسبت رکھتے ہیں لہٰذا امکان یہ ہے کہ سہوِ کاتب کی وجہ سے ''بہ غربتے'' کو ''بہ عزتے'' پڑھ لیا گیا اور شعر مہمل ہو گیا۔ یہ شعر کلیات میں بعد تصحیح اس نئی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔

املا کے سلسلے میں ترقی اردو بیورو کی کتاب ''املا نامہ'' کے طے کیے گئے رہنما اصولوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جدید املا اختیار کیا جائے۔

کلیات میں شامل فاروقی صاحب کا مضمون اس حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں میر کی شاعری اور اس کی لفظیات کے ایک نئے پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس پر اب تک لوگوں کی نظر نہیں پڑی تھی۔ خصوصاً طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ اس لیے بھی مفید ثابت ہوگا کہ اس کتاب سے نہ صرف میر کی شعری دنیا اور اس کے تلازمات سے واقفیت حاصل ہوگی بلکہ تدوین کے اصولوں اور مختلف اصناف شعری کی درجہ بندی اور ذیلی تقسیم کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوں گی۔ کلیات کی دونوں جلدوں کی ترتیب و تدوین میں جس سنجیدگی اور محنت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ اپنے کام کے تئیں مرتب کے احساسِ ذمے داری پر دال ہے۔ اس کے ساتھ ہی کونسل بھی شائقین اردو کی جانب سے اس ضخیم کلیات کی ترتیب واشاعت کے لیے شکریے کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ تفہیمِ میر کے سلسلے میں یہ کلیات طلبہ کی رہنمائی اور اردو داں طبقے کی تسکینِ ذوق دونوں کے لیے اہم ثابت ہوگی۔

● بنات النعش

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

صفحات: 151، قیمت: -/78 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: مشکور معینی، 224، پیریار ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

''بنات النعش'' ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول ہے۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' تھا۔ شروع میں اردو کے ناول نگاروں نے ایک خاص مقصد کے تحت ناول لکھے جن میں فن کم اور مقصدیت زیادہ تھی۔ ''مراۃ العروس'' کی تخلیق سے تعلیم واخلاق اور امور خانہ داری کی تربیت مقصود تھی۔ ''بنات النعش'' کا موضوع بھی معاشرے کی اصلاح ہے۔ شاید اسی لیے نذیر احمد نے ''بنات النعش'' کے دیباچے میں اسے ''مراۃ العروس'' کا دوسرا حصہ قرار دیا ہے۔

اس کتاب کا تازہ اڈیشن اردو کونسل نے شائع کیا ہے۔ اردو کے کلاسیکی سرمایے کو از سرِ نو ترتیب دینے اور شائع کرنے کا کام قومی اردو کونسل بہ حسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ مذکورہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

''بنات النعش'' میں نذیر احمد نے ایک نسوانی کردار حسن آرا کے حالات زندگی کو ناول کی شکل میں بیان کیا ہے۔ حسن آرا دلی کے ایک بڑے اور شریف خاندان کی گیارہ سالہ لڑکی ہے۔ دولت کی کثرت اور والدین کے بے جا لاڈ پیار اور نوکرانیوں اور لونڈیوں کی خوشامد نے اسے انتہائی درجے کی مغرور اور شریر بنا دیا تھا۔ اس کے اندر وہ تمام برائیاں پیدا ہوگئی تھیں جو ایک رئیس گھرانے کی بگڑی ہوئی اولاد میں ہوا کرتی ہیں۔ حسن آرا جوں جوں سن بلوغ کو پہنچتی ہے، اس کے نخرے اور شرارتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ حسن آرا کی بدمزاجی اور آئے دن کی شرارتوں سے گھر کے سبھی لوگ نالاں تھے۔ اس کا اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔ وہ والدین کی تعظیم تک نہیں کرتی تھی۔ اس کی بے ادبی اور بڑھتی ہوئی شرارتوں کو دیکھتے ہوئے حسن آرا کی خالہ نے اپنی بہن سلطانہ بیگم کو یہ مشورہ دیا کہ حسن آرا کو اصغری کے مکتب میں داخل کرادیں۔ اصغری بیگم ایک نیک اور صالح خاتون تھیں۔ حسن آرا جب اصغری بیگم کے مکتب میں داخل کی گئی تو اس وقت بقول نذیر احمد ''کوئی خرابی نہ تھی کہ اس کے مزاج میں نہ ہو، اور کوئی بگاڑ نہ تھا کہ اس کی عادتوں میں نہ ہو، مکتب گئی تو شرارت، بدمزاجی، بدزبانی، خودپسندی، بے باکی، بدسلیقگی اور اپنی قدیم سہیلیوں کو ساتھ لیتی گئی۔'' مگر اصغری بیگم نے بڑی حکمتِ عملی سے حسن آرا کو تعلیم وتربیت دی۔ اصغری بیگم کی صحبت کا ہی نتیجہ تھا کہ حسن آرا فرماں بردار، اخلاق مند، دیندار، صاحب کردار، اور ایک ذمہ دار لڑکی بن گئی۔

''بنات النعش'' میں حسن آرا کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اور شرارتی بچوں کو بھی اگر صحیح وقت پر اچھی تربیت دی جائے تو ان کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ ''بنات النعش'' ایک اصلاحی ناول ہے اور اس ناول میں نذیر احمد نے حسن آرا کی تعلیم وتربیت اور اس کی اصلاح میں پیش آنے والی دشواریوں کو بڑی خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ اگرچہ نذیر احمد نے یہ ناول اپنے دور کے معاشرے کی اصلاح اور اپنے عہد کے بچوں کی مناسب تعلیم وتربیت کے پیش نظر لکھا تھا، مگر عصر حاضر میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔

● کاسۂ شب (شاعری)

شاعر: راشد طراز

صفحات: 104، قیمت: -/100 روپے

ناشر: اردو مرکز، 247، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ-800020

مبصر: ارشد عبدالحمید، ''احمد ولا''، کالی پلٹن، ٹونک-304001

''کاسۂ شب'' راشد طراز کا شعری مجموعہ ہے۔ راشد طراز نئی نسل کے نمائندہ شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے شاعری کا آغاز اس وقت کیا جب

جدیدیت کی پہلی صف اپنا کام کم وبیش ختم کر چکی تھی۔ غزل میں ایک نوع کا ٹھہراؤ سا تھا اور جدیدیت کی اساس لفظیات ایک روایت میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس عہد میں جن فنکاروں نے نئی نسل کی نمائندگی کی ان میں اسعد بدایونی اور عالم خورشید کے ساتھ راشد طراز بھی شامل ہیں۔

جدیدیت نے فارم، لفظیات اور موضوعات میں جس تجربہ پسندی کا ثبوت دیا اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن بعض شعرا ایسے بھی تھے، جنھوں نے عام فہم زبان میں شعرگوئی کی وکالت کی۔ روزمرہ کی زبان جس میں انگریزی الفاظ بھی شامل تھے، اظہار کا ذریعہ بنی اور اس طرح تنوع میں اضافہ ہوا۔ راشد طراز نے اپنی تخلیقی ضرورتوں کے تحت ہر طرح کی لفظیات سے فطری معاملہ کیا اور اپنی بات اپنے الفاظ میں کہی۔ یہی وجہ ہے کہ کاسۂ شب میں افکار کی گہرائی کے ساتھ الفاظ کی تازگی اور تنوع بدرجۂ اتم موجود ہے۔

راشد طراز کی دوسری خوبی احتجاج کا وہ انداز ہے جو نہ تو نعرے بازی اور برہنہ گفتاری سے تعبیر ہے نہ ذات کے نہاں خانوں میں گم ہوجانے والی خاموشی کا اسیر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ احتجاج نظریے کا نہیں، حالات کا زائیدہ ہے۔ ''کاسۂ شب'' میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں ظلم وستم پر غم وغصے کا اظہار کیا گیا ہے لیکن یہ اظہار فن کی لطافت اور شعریت سے مزین ہے۔

رات آخر ہو ستم پیشوں پہ ایسا بھی نہیں
وقت رک جائے کہیں آ کے یہ ہوتا بھی نہیں

فریاد ہے کوئی کہ ہے اندازِ بغاوت
اے برگِ شکستہ تری گفتار میں کیا ہے

مٹا کر صاحبِ حق کو بھی جب قاتل نہیں فارغ
تو سب ہیں دم بخود اگلا نشانہ کون بنتا ہے

خاموش رہنے والے بھی قاتل کے ساتھ تھے
خنجر کو جو رگوں پہ رواں دیکھتے رہے

ایک اور خوبی جو اس مجموعے کو توجہ کا حامل بناتی ہے، اسلوب کی دلکشی اور مضامین کا تنوع ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض احتجاج یا حالات کی عکاسی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ذات اور کائنات کے حوالے سے مختلف جہات کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف کائنات کو ذات کے وسیلے سے دیکھا ہے تو دوسری طرف ذات کو کائنات کے وسیلے سے دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

جھکنا تھا سر کو اوّل و آخر اسی جگہ
افسوس ہے یہ کام بھی تاخیر سے ہوا

مرے وجود میں آہنگِ آتشیں ہے کوئی
شرار بن کے جو پتھر میں رہنا چاہتا ہے

نیا افق مری آنکھوں پہ اب ہویدا ہے
جہانِ شوق دمِ واپسیں پہ روشن ہے

راشد طراز کی زمینیں عموماً نئی ہیں۔ بحروں میں تنوع ہے۔ اپنی نسل کے بہت سے دوسرے شعرا کی طرح بحرِ مجتث مثمن مخبون ان کی پسندیدہ بحر ہے۔ کلام فنی عیوب سے عموماً پاک ہے البتہ اکا دکا اشعار میں جہاں تہاں مصرعے دولخت ہوگئے ہیں یا مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوا ہے مثلاً:

آہنگِ شکستہ دلی اظہار میں کیا ہے
کچھ داغ سایہ شیشۂ پندار میں کا ہے

یا

اپنے لیے چراغ نہ آنسو نہ پھول ہے
کیا میری شکل میں بھی یہ شانِ نزول ہے

اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے اشعار گنتی کے ہیں اور یہ اشعار بھی اغلباً اس لیے راہ پاگئے ہیں کہ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ بات طے ہے کہ راشد طراز کی تخلیقی اپج اور نئی نسل کی غزل گوئی کا اندازہ کرنے کے لیے ''کاسۂ شب'' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

● نیرنگِ خیال'' کا موضوعاتی اشاریہ

مرتب: دیوان حنان خاں

صفحات: 240، قیمت: -/192 روپے

ناشر: مرتب، IV/35، این سی ای آر ٹی، اربندو مارگ، نئی دہلی-16

مبصر: محمد معظم الدین، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، اربندو مارگ، نئی دہلی-16

زیرِ تبصرہ کتاب دیوان حنان خاں کا ایم فل کا مقالہ ہے جس میں رسالہ ''نیرنگِ خیال'' کے 1924 سے 1947 تک کے شماروں کا موضوعاتی اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔ ''نیرنگِ خیال'' کے ان خاص نمبروں کی فہرست بھی دی گئی ہے جن تک مرتب کی رسائی ہوسکی ہے۔

علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں کسی ادبی رسالے کے موضوعاتی اشاریے کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ اس طرح کے اشاریوں کا سب سے بڑا مقصد وضاحتی مواد فراہم کرنا ہوتا ہے تاکہ رسالے کے تمام شماروں کی ورق گردانی سے، جو کہ ایک صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے اور جو ایک جگہ دستیاب بھی نہیں ہوتے، بچا جاسکے۔ موضوعاتی اشاریے اس لحاظ سے بہت کارآمد ہوتے ہیں کہ مختصر وقت میں مطلوبہ مواد کی فراہمی آسان ہوجاتی ہے اور محققین کو تگ ودو

کرنے اور مالی اخراجات سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ دیوان حنّان خاں کا مرتب کردہ یہ اشاریہ اردو کے مطبوعہ اشاریوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ بقول مرتب "اس میں اشاریہ سازی کے جدید تر طریقے اور تکنیک کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

پورا مقالہ دو حصوں میں یعنی حصۂ نثر اور حصۂ نظم میں منقسم ہے۔ حصۂ نثر میں مختلف قسم کے مضامین کی درجہ بندی تحقیقی، تنقیدی، معلوماتی، تاریخی، سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی عنوانات سے کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مختلف نثری اصناف یعنی داستان، ناول، افسانہ، کہانی، ڈراما، انشائے لطیف، ادب لطیف، انشائیہ، طنز و مزاح، سوانح، خاکہ، سفرنامہ وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ کچھ متفرق نگارشات جیسے پیروڈی، ادب پارے، ادب زریں، اقوال زریں، روداد، روزنامچہ، تبصرہ، مراسلہ اور تعارف وغیرہ کو بھی اسی زمرے میں جگہ دی گئی ہے۔

حصۂ نظم میں شعری اصناف کی درجہ بندی نظم، سانیٹ، غزل، گیت، قطعات، رباعیات، حمد، نعت، منقبت، دعا، مرثیے اور قصیدے کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ آخر میں "آرٹ" کے تحت "نیرنگِ خیال" میں شائع شدہ تصاویر کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

ان تمام موضوعات کو جیسا کہ عام قاعدہ ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اگرچہ "نیرنگِ خیال" کے کچھ شمارے زمانے کی دست برد بالخصوص تقسیم ہند کے سانحے کی نذر ہوگئے جن کا ذکر نہ ہوسکا اس کے باوجود یہ اشاریہ کارآمد ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر دیوان حنان خاں کے مرتب کردہ اس اشاریے سے محققین بالخصوص ریسرچ اسکالر حسب ضرورت مستفید ہوں گے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب، کاغذ اور طباعت معیاری ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

● ششماہی "تنقید"

مدیر: قاضی افضال حسین

صفحات: 304

ناشر: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی- 110007

ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو رسائل کی تعداد بہت زیادہ لیکن ادبی رسائل کی تعداد کم ہے، جن میں سے محض چند کو معیاری کہا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے جاری ہونے والا یہ ششماہی رسالہ اگرچہ اپنی عمر کی ابھی دوسری منزل میں ہے لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں جس طرح سے اس کی پذیرائی اور تحسین ہوئی ہے اسے فال نیک سمجھنا چاہیے۔ اردو کے ذاتی ملکیت والے بعض رسالے اپنے مدیر کے ذہنی تعصبات کی اشاعت اور اپنے ممدوح کی دفاعی جنگ کی خدمات انجام دے رہے ہیں تو بعض اداروں کے رسالے اپنے مدیر کی ذاتی فتوحات کے نقیب کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ "تنقید کے مدیر کا موقف" یہ ہے کہ "تنقید" کسی فرد کی ملکیت یا کسی تحریک کا نمائندہ نہیں بلکہ ملک میں ادب کے اہم شعبے کی فکری/علمی ترجیحات کا نمائندہ ہے۔ ہمیں کسی تحریک، ادبی موقف یا ضروری بحث سے پرہیز نہیں اور ہم ادبی مباحث میں اقتداری فیصلوں سے بھی گریز نہیں کرتے مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ بحث کی سطح بلند، پیرایۂ اظہار معیاری اور گفتگو عالمانہ ہو۔" (اداریہ تنقید: جون 2005) اسی طرح مدیر نے رسالے میں شمولیت کے لیے مضمون نگار کی منصبی، فکری یا علاقائی حیثیت کی بجائے مضامین کی ادبی اور فکری سطح کو معیار قرار دیا ہے۔

"تنقید" کے پہلے شمارے کا موضوع "اردو افسانے کی ایک صدی" تھا، زیر تبصرہ شمارے کا موضوع "مابعد جدیدیت" ہے، جس میں لاتشکیل، مابعد جدیدیت، نئی تاریخیت اور تانیثیت جیسے اہم مباحث پر آٹھ مضامین شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے رسالے میں اردو کا ایک بھی طبع زاد مضمون نہیں ہے۔ تمام مضامین مغربی مفکرین کے رشحات قلم کے تراجم ہیں۔ لاتشکیل کے تحت پیروڈی ڈیما کے مضمون کا ترجمہ خالد جاوید نے "دریدا: لاتشکیل، فلسفہ اور ادبی تھیوری" اور روڈالف گاشے کے مضمون کا ترجمہ "لاتشکیل: بحیثیت تنقید" کے عنوان سے پروفیسر قاضی افضال حسین نے خود کیا ہے۔ مابعد جدیدیت والے حصے میں ژاں فرانسوا لیوتارڈ، اینڈریس ہیوس اور ڈیوڈ ہاروے کے مضامین کے ترجمے علی الترتیب جلال الحق، پروفیسر شافع قدوائی اور سہیل احمد فاروقی نے "مابعد جدیدیت"، "مابعد جدیدیت کی خاکہ بندی" اور "پس جدیدیت کی صورت حال" کے عنوانات سے کیے ہیں۔ "نئی تاریخیت" کے عنوان سے ژان، ای ویسن کے مضمون کا ترجمہ فرحت احساس نے کیا ہے۔ اس شمارے میں تانیثیت کے موضوع پر ڈاکٹر ارجمند آرا کے دو ترجمے شامل ہیں پہلا جولی رفکن اور رمائیکل ریان کے مضمون کا ترجمہ "تانیثیت کے نقوش: ایک تعارف" کے عنوان سے اور دوسرا شوشانا فیلمین کے مضمون کا ترجمہ "عورتیں اور جنون: ایک تشویشناک لغزش فکر" کے نام سے۔ آخرالذکر مضمون اپنے موضوع، مواد اور فکر کے اعتبار سے اردو میں نیا اور خوشگوار اضافہ ہے۔

یہ تمام مضامین اپنے قاری سے ایک خاص نوع کی ذہنی تربیت، علمی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور سیمیناروں کے مقالہ نگار حضرات کو اس شمارے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اردو کے سنجیدہ قاری اور اپنی پسند سے شعبۂ اردو میں داخلہ لینے والے طالب علموں کے لیے بھی یہ شمارہ بیحد مفید ہے۔

□□□

نذیر احمد یوسفی

کامیابی کی سیڑھی

آئینے میں خود کو جاننے اور پہچاننے کی عمر آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے خط و خال کافی جاذبِ نظر ہیں۔ رنگ صاف ہے، سر کے بال گھنے اور کالے ہیں اور آنکھیں دلکش، اوپر کے ہونٹ پر ایک سرخی مائل لمبا سا داغ ہے، جس کی وجہ سے نیچے کے ہونٹ کی بہ نسبت اوپر کا ہونٹ، کسی قدر اونچا ہو گیا ہے، دانتوں کی قطار میں سامنے کے دو دانت اوسط سے کسی قدر بڑے ہیں اور نچلے ہونٹ پر چھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پہنچ نہیں پاتے—

اتنا کچھ ہونے کے باوجود چہرہ مناسب ہی سا لگتا تھا— عمر کے لحاظ سے جسم کی ساخت بھی ٹھیک تھی، تمام اعضا کسے اور کسرتی سے تھے۔ صرف ایک کمی تھی کہ بائیں ہاتھ کا آخری سرا، اپنے ایک خاص حصے سے محروم تھا یعنی داہنا ہاتھ مکمل تھا لیکن بایاں نامکمل۔ اس کی ہتھیلی کے ساتھ پانچوں انگلیاں نہیں تھیں، یہ ایک نمایاں عیب تھا جو میرے کچے ذہن نے فوراً محسوس کر لیا۔ میری عمر کے تمام لڑکے اوپر سے نیچے تک پورے تھے کہیں سے کوئی کمی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان کی موجودگی میں میری ذات ہی ادھوری تھی شاید اسی لیے کھیل کود کے میدان میں وہ میری طرف سے تغافل برتتے تھے۔ ان کی نظروں میں کبھی میری حیثیت بیکار کی رہتی اور کبھی تاسف بھرے احساس کے تحت، وہ کھیل میں شامل کر لیتے۔

گلی ڈنڈا ہو یا کرکٹ کی دوڑ، میری تیزی اور چستی کے مقابل کوئی نہ نکلتا، بس کمی تھی ایک، کبھی کیچ نہیں لے سکا۔ کبھی کبھی میرے ایک ہاتھ کے کمال نے کھیل کا پانسہ ضرور پلٹا لیکن یہ چمتکار شاذ و نادر ہی ہوتا۔ زیادہ تر گیند، میرے بیٹنگ میں چوکے اور چھکے لگا کر، ان کی مردہ دلی کو خوش دلی میں نہ بدل دیتا۔

یوں تو میرا نام والدین نے خیر الدین رکھا تھا اور میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا لیکن جب میں نے آئینے میں خود کو پہچان لیا تو مجھے اپنے نام سے چڑ ہو گئی— ابھی اسکول میں داخلے کی بات چل رہی تھی۔ باجی کو پڑھانے والے ماسٹر صاحب کی کوششوں سے میں نے درجۂ چہارم کی نصابی کتابیں گھر ہی میں ختم کر لی تھیں اور ابا جی کے ایک دوست کی مدد سے، امید تھی کہ کسی بھی پرائمری اسکول میں داخلے کی مشکلات پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ نام کے سلسلے میں میرے احتجاج پر اور سرفراز، کی ترجیح پر تھوڑی سی رد و قدح کے بعد خیر الدین کی جگہ سرفراز کو قبول کر لیا گیا۔

باجی مجھ سے چار سال بڑی تھیں اور ساتویں درجے میں پڑھ رہی تھیں۔ تیسرا بھائی ابھی امّی کی گود میں تھا، بس یہ مختصر سی فیملی تھی۔ ابا ریلوے کے محکمے میں آفس کلرک تھے۔ سیدھے سادے آدمی تھے، بچوں کی تعلیم اور عمدہ تربیت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی میری جسمانی کمزوریوں کی بنا پر وہ اداس ضرور دیکھے گئے لیکن ان کی ہمت افزا گفتگو نے برابر میری حوصلہ افزائی کی— انھوں نے ہی بتایا کہ یہ عیب پیدائشی ہے۔ اوپر کے ہونٹ کو تو دو سال ہوئے آپریشن سے جوڑ دیا گیا لیکن ہاتھ کے پنجے کی کمی، شاید زندگی بھر ساتھ رہ جائے—

انھوں نے میری تسکین اور احساسِ پشیمانی کو کم کرنے کے لیے کہا تھا، ویسے یہ کمی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو پیدائشی مجبور و معذور ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اس کمی کی جگہ انھیں دوسری بہت ساری اضافی خوبیاں عنایت کر دی ہیں۔ اب اس کمزور انسان پر منحصر ہے کہ وہ ان بیش قیمت خوبیوں اور صلاحیتوں کو استعمال کر سکتا ہے کہ نہیں۔ اب یہی دیکھیے پنجاب کے مہاراجا رنجیت سنگھ کی ایک آنکھ نہیں تھی لیکن انھوں نے پنجاب کی راج گدّی سنبھالی اور خوب نام کمایا، مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے دادا محترم، بادشاہ تیمور لنگ، صرف نام کے لنگڑے نہیں تھے بلکہ سچ مچ میں پاؤں سے معذور تھے لیکن فرغانہ کے بادشاہ رہے۔

ابا جی کی باتوں سے زیادہ، میرے ارادے اہم تھے، جنھوں نے مجھے کچھ کرنے اور بننے کو اکسایا، میں نے اس سلسلے میں کسی کو گواہ بنایا نہ رہنما، بس من ہی من یہ طے کر لیا کہ مجھے ان سالم ہاتھ کے لڑکوں سے آگے رہنا ہے اور نمایاں حیثیت سے رہنا ہے، بس ان جوشیلے خیالوں نے میرے اندر بجلی سی بھر دی۔ میں پڑھنے لکھنے میں اور زیادہ وقت صرف کرنے لگا اور ہوم ٹاسک اور دوسرے اہم کام پوری توجہ اور مستعدی سے کرنے لگا— کھیل کود کے اوقات میں کمی کر دی میدان جاتا بھی تو کھیل سے زیادہ کھیل کے طور طریقوں پر نظر رکھتا۔ دوسرے ہفتے میں چچا سراج

لڑکے للو سے ملا جس کی ایک ٹانگ پولیو کی وجہ سے کمزور تھی اور جس کی وجہ سے اس کی چال میں یکسانیت نہیں تھی، کسی قدر ڈگمگا کے چلتا تھا۔ عبدالصمد تمباکو والے کے لڑکے سلیم کے پاؤں کا ایک حصہ کسی قدر خم تھا، وہ بھی متوازن رفتار سے چلنے میں دقت محسوس کرتا تھا۔ اس کے بعد عابد سے ملا، اس کے ایک ہاتھ میں صرف دو انگلیاں تھیں، وہ بھی کھیل کود میں، ان ہاتھوں سے کوئی خاص کارکردگی کا مظاہرہ کرنے سے معذور تھا—

یہ تو وہ لڑکے تھے جن سے میرا تعارف تھا اور کسی حد تک بے تکلیف بھی، انھی کی مدد سے چند اور معذور لڑکوں سے ملاقاتیں ہوئیں، سب ذہنی انتشار کے شکار تھے۔ میں نے ان نئے دوستوں کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ میں ایک ایسی کرکٹ ٹیم تشکیل دے رہا ہوں جس میں ہم جیسے کھلاڑی ہی اپنی کارکردگی کا مظاہرہ عمدہ کھیل کی صورت میں پیش کریں گے۔ ہم سب کی مجموعی کوشش یہ ہوگی کہ ہم کلب کی ساکھ بنائیں اور ایسا کھیل دیکھنے والوں کے سامنے پیش کریں کہ ہمارا نام ہو اور ہر مقابلے میں ہمیں مدعو کیا جائے—

میری تجویز سب کو پسند آئی۔ صرف ایک مہینے میں معذوروں کی اس ٹیم کو اتنی مقبولیت ملی کہ لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ عطیات، ڈونیشن، تمغے اور انعامات سے ہمارے کلب کی چھوٹی سی کوٹھری بھر گئی، اخباروں میں رپورٹیں آنے لگیں۔ اسپورٹس جرنلسٹس نے ہماری تعریف اور تصویروں سے اپنے اخبار کے کالم سیاہ کیے۔ اس طرح ہم معذوروں کی ٹیم نے صحت مندوں کی ٹیم سے کہیں زیادہ شہرت کی بلندیاں چھولیں۔

یہ سب کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی پڑھائی پر پوری توجہ رکھی۔ کھیل کود میں نام اور شہرت تو مل ہی رہی تھی لیکن ان تفریحات میں وقت کا اتنا ہی حصہ صرف کر رہا تھا جتنا کے میں نے کھیل کے لیے رکھ چھوڑا تھا، اس لیے کسی کو شکایت کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے پڑھنے اور کھیلنے کے جو اوقات مقرر کر رکھے تھے ان میں فرق شاذ و نادر ہی ہوتا تھا— میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنے ساتھ رہنے اور کھیلنے والے دوسرے لڑکوں کے دلوں میں بھی اسی طرح کے عزم و یقین کے جذبے بھر دوں، جن سے میرے دل و دماغ منور تھے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ میری باتوں کا اثر ان پر کتنا ہوتا ہے۔ گھر پر مطالعۂ کتب میں دل لگاتے ہیں یا نہیں— یا میدان میں، کھیل کود میں وقت ضائع کرتے ہیں لیکن یہ شک، فائنل امتحانات کے بعد از خود زائل ہو جاتے۔ تمام ساتھیوں میں کچھ کر دکھانے کی لگن شدید تر ہو گئی تھی۔

درجہ آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے تو ہماری ٹیم کو شہر سے باہر نکل کر ضلعی سطح پر کھیلوں کے نمائشی پروگرام میں بھی شرکت کی دعوتیں ملنے لگی تھیں، ہماری ہر طرح سے پذیرائی کی جا رہی تھی۔ انعامات، اعزازات اور توصیفی اسناد کے علاوہ کتابوں کے تحفے، کھیل میں کام آنے والا سامان اور تعلیمی وظیفے۔

برسوں ہوگئے ان باتوں کے گزرے

اب آپ سے کیا چھپانا، آج ہم زندگی کے عملی میدان میں کھیلنے آگئے ہیں۔ تمام ساتھی فزیکلی ان فٹ تھے لیکن علمی لیاقتوں کی بنا پر معزز ملازمتوں سے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے بحیثیت اردو ٹیچر، شہر کا نامی گرامی ہائی اسکول جوائن کر لیا ہے۔ میرے دوسرے رفقا بھی بڑی کمپنیوں اور قومی اداروں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں باعزت اور پروقار ملازمتوں اور پیشوں میں ہونے کے باوجود، ہمارے اندر اپنی شخصیت بنانے کا جذبہ بیدار ہے۔ عزائم ٹھنڈے نہیں ہوئے ہیں بلکہ اخباروں کے مطالعے اور دیگر اہم ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کی روشنی میں ہم سب دوست، اب صوبائی حکومت کے زیر نگرانی ہونے والے مقابلہ جاتی امتحانات کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جان توڑ تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ کئی ایک نے تو IPS اور IAS ہدف بنالیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب بصارت سے کمزور شری روی اروڑا، ایک پاؤں سے پولیو زدہ، شری الگا ناتھن اور ٹخنے سے کمزور شری رگزن کچھائل حکومتی سطح کے معزز عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں؟ ہمارے پاس خود اعتمادی، حوصلہ اور عزم صمیم— جیسی بیش قیمت طاقتیں ہیں، جن کی مدد سے ہر ناممکن کو ممکن کر سکتے ہیں۔ اندر کی سوتی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر کے کامیابی کی بلند سیڑھیوں پر چڑھ سکتے ہیں، زندگی کے الجھے مسئلوں پر ہنستے کھیلتے قابو پا سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ سخت محنت اور عزم و ارادہ کو ہمراہ رکھیں اور احساسِ محرومی و معذوری کو دور۔

First Deserve Then Desire (پہلے کچھ بنو پھر آرزو کرو) کی انگریزی کہاوت نے وہ روشنی بکھیری ہے کہ اب ہم اندھیروں میں بھٹکنے کی سوچ ہی نہیں سکتے، بس آپ ہمارے لیے دعائیں کیجیے کہ ہمیں کامیابی ملے۔

□□□

پتہ:
Urdu Darbar,
Rahmmania School Street,
Asansol-2 (W.B.) 713302

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کا نظام جمال (جلد اول، دوم، سوم)	1311.00	328.00
19	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
20	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
21	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
22	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
23	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
24	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
25	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
26	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
27	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
28	انسانی ارتقا	70.00	18.00
29	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

30	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔1-6)	3400.00	850.00
31	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔1-4 اور 6-8)	1790.00	448.00
32	جنت سنگار	180.00	45.00
33	کلیاتِ پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00
34	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
35	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم)	472.00	118.00
	لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)		
36	مجموعہ نغز	268.00	67.00
37	مسدود راہیں	126.00	32.00
38	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
39	مولیئر	57.00	14.00
40	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
41	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
42	پشکن	60.00	15.00
43	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
44	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
45	قومی زبان	76.00	19.00
46	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
47	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
48	سیرِ کہسار	167.00	42.00
49	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
50	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
51	تنقید عقل محض	158.00	40.00
52	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
53	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
54	تشریح تصاویر	66.00	17.00
55	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
56	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔1-5)	431.00	108.00
57	تالستائے	46.00	11.00
58	اصول معاشیات	47.00	12.00
59	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
60	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
61	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
62	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00

63	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
64	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
65	عکس اور برعکس	128.00	32.00
66	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
67	بھارت 2004	250.00	63.00
68	دھوپ چولھا	38.00	10.00
69	اجارہ	131.00	33.00
70	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 6	1163.00	291.00
71	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
72	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	13.00	03.00
73	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
74	ابتدائی ساجیات	43.00	11.00
75	ارتقائے کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
76	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
77	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
78	کائنات جلیل	80.00	20.00
79	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
80	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
81	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
82	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
83	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
84	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	98.00	25.00
85	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
86	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
87	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
88	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
89	سخنوران گجرات	77.00	19.00
90	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
91	تاریخ آصفی	58.00	15.00
92	اجرتیں	95.00	24.00
93	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	178.00	45.00
94	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2008 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر.کے. پورم، نئی دہلی 110066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدر آباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیّدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدر آباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات :823، قیمت-/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات :732، قیمت :-/138 روپے

کلیاتِ عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مردّف دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات 556، قیمت -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات :430، قیمت -/128 روپے

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصّل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت :-/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت :-/40 روپے

کلیاتِ فانی

مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز سخن جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات 318، قیمت :-/63 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام آثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

اڑیسہ میں اردو

مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب حاصل مطالعہ کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات :504، قیمت -/157 روپے

نوٹ -: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Date of Publication : 24/10/2007

URDU DUNIYA Monthly, November 2007, Vol. 9, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

اردو والوں کے لیے سنہرا موقع
کتابوں پر خصوصی رعایت

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Govt. of India, New Delhi

نواں کل ہند

اردو کتاب میلہ

17 تا 25 نومبر، 2007

नवां कुल हिन्द उर्दू किताब मेला

9th Kul Hind Urdu Kitab Mela

ENTRY FREE

داخلہ مفت

بہ اشتراک : بہار اردو اکادمی، پٹنہ

مقام : مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔6	وقت : صبح 11.00 بجے سے رات 8.00 بجے تک

اردو زبان میں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں ملک بھر کے تمام مشہور و معروف ناشرین شرکت کر رہے ہیں کتاب میلے کے دوران روزانہ مختلف پروگرام جیسے سیمینار، مذاکرہ، مشاعرہ، شام غزل، بیت بازی وغیرہ بھی منعقد کیے جائیں گے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک:8، ونگ:7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938